دبستانِ فلم کے
نعت نگار

اکرم کنجاہی

ریسرچ سینٹر

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

دبستانِ فلم کے نعت نگار

اکرم کنجاہی

نام کتاب .... دبستانِ فلم کے نعت نگار

مصنف .... اکرم کنجاہی

کمپوزنگ .... اشفاق ایاز

سرورق ....

اشاعت........ جنوری 2023ء

ISBN :

ملنے کا پتہ :

انتساب

نام ور نعت خوان ، نعت نگار اور محقق
جناب سیّد صبیح رحمانی کے نام
جو اِس کتاب کا محرک ہیں

فہرستِ مضامین

☆☆☆

دبستانِ فلم کے نعت نگار: اعتقاد اور انتقاد کا سنگم

جناب اکرم کنجاہی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ موضوع چنتے ہوئے انفراد سے اکثر دستبردار نہیں ہوتے۔ اس طرح اپنے تحقیقی وتنقیدی دوائر کو رسمی روایتی مضامین سے مناسب فاصلے پہ رکھنا ان کا ترجیحی عمل ٹھیرا۔ دراصل یہی طبعی گریز، نسبتاً قلیل مقداری اثاثے پر اکتفا، تسوید میں توقف، ندرت کی جانب جھکاؤ اور فوری مقبولیت سے بے نیازی سمیت چنیدہ رجحانات کسی لیکھت کو مشہور کرنے کی بجائے ممتاز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مذکورہ مصنف کی تازہ تصنیف: ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' اس لیے بھی توجہ کا مرکزہ بنے گی کہ فلم ایسے 'کمرشل کم پاپولر میڈیم' کے ذخیرے سے کسی سنجیدہ و معتبر ادبی جہت کی دریافت بادی النظر میں جوکھم کا کام ہے۔

کم وبیش پون صدی کو محیط متذکرہ مواد کی چھان بین کے دوران اکرم کنجاہی صاحب نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ اصنافِ نثر میں ڈراما اور اصنافِ نظم میں گیت اپنے مجرد متن کے ساتھ تاثر کو ادھورا یقین کرنے پر مجبور ہیں۔ واقعتاً یہاں 'ٹیکسٹ' محض ایک جزو ہے بلکہ اسے قائم بالغیر کہیے۔ جب تک ڈرامے/فلم کا سکرپٹ دیگر متعدد لوازم کے ساتھ 'مکمل پیش کش' میں مبدل نہ ہو جائے، وہ 'معلق' رہتا ہے؛ جب تک ملفوظ گیت ساز و آواز کی شمولیت سے محروم رہے، اسے جسد کی متلاشی روح کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب قضیہ یہ ہے کہ 'فلمی شاعر' ہونا ہی ایسی 'تہمت' بن گئی ہے کہ 'با قاعدہ سخن ور' ایسے شہرت یافتہ کوی سے دوری میں اپنی تخلیقی عظمت مضمر سمجھتے ہیں۔ بصد اعتذار! اسے ملائم سی نرگسیت کہنا بے جا نہ ہوگا۔ تسلیم کہ مجموعی انحطاط نے فلمی شاعری کو بھی خاصی زک پہنچائی ہے لیکن اس بنیاد پر فلم کے لیے نغمے لکھنے والوں ہی کو سرے سے مسترد کر دیا جائے، معقول طرزِ احساس نہیں ___ ضمناً عرض ہے کہ حال ہی میں آفتاب خان: ''اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ'' سے

معنون اپنی ایک وقیع کتاب منظرعام پرلائے ہیں، جس میں موثرتعیین قدراس سرمائے کے اثبات کے لیے کافی ہے ___ تاہم Defecto صورت حال کومدنگاہ رکھا جائے تو فلموں کے لیے گیت لکھنے والوں کی نعتیہ شاعری اور وہ بھی فلمی ضرورت کے تحت، کچھ نہ کچھ ذہنی تحفظات کو بڑھاوا تو دے گی!

اس طرف سے لپٹا ہوا یہ نکتہ بھی بیان کا مطالبہ کرتا ہے کہ کئی نعتیں ایسی ہیں جنھیں وسیع پذیرائی پہلے مل چکی تھی۔ان کے خالق بھی فلمی Lyricists نہیں تھے۔ایسی نعتوں کوفلموں کا حصہ بعد میں بنایا گیا۔کیا یہ عمل ان نعوت کی مرتبت کو متاثر کرنے کا سبب بنا؟ یہ سوال ایسا سادہ نہیں ہے۔مقام کی تبدیلی بلاشبہ اثر انداز ہوتی ہے۔حکمت کی بات کس زبان سے ادا ہو رہی ہے؟ مخصوص اخلاقیات سے وابستگان میں یہ استفہام نظرانداز نہیں ہوسکتا۔نعت نگاروں کا نگارخانے میں قدم خاص سماج کی آنکھ اور طرح سے دیکھے گی۔لوگ باگ عملی لحاظ سے کیسے بھی ہوں مگر کسی فلمی گانے کی دھن پر نعت کی کمپوزیشن انھیں مضطرب کرتی ہے۔معتدل سوچ رکھنے والے اسی لیے نعت خوانی کو'پروفیشن' بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ ان محافل کو کمائی کا ذریعہ بنانے والے زرق برق نعت خوانوں ہی نے سٹریٹ سانگز کو سامنے رکھ کر نعتوں کی طرزیں بنالیں۔مارکیٹ میں ایسی نعتوں کے انتخابی مجموعے بھی دستیاب ہیں جن میں ہرنعت کے اوپر فلمی گانے کا شعر درج ہے جس کی طرز پر اس نعت کو گایا جاسکتا ہے۔اصولی طور پر تو نعت کے لیے خوش نوائی ممنوع ہے نہ سنگیت اس کے لیے ناجائز ہے مگر کسی گانے کی لے پر جب نعت گائی جائے گی تو پہلا دھیان مشہور دھن کی جانب ہی منتقل ہوگا، یوں منزہ احساسات کو جھٹکا لگے گا۔من میں جاگزین ارادت/ پوترتا کو گزند پہنچے گا۔مثلاً کہا جاتا ہے سفلی جذبات کو Provoke کرنے کے لیے ٹھمری اور دادرا ایجاد ہوئے۔اب اس رعایت سے بول بنانے کی پرکشش کلا آزمائی تو جاسکتی ہے مگر اس ذریعے پر انحصار کرتے ہوئے حمدیہ/نعتیہ رجحان کا استعمال زیادتی ہوگی۔

اکرم کنجاہی نے ان مسائل سے اغماض نہیں برتا چنانچہ انھوں نے ناگزیر توضیحات پیش کر دی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس کتاب کے مقدس و موضوع اور آداب کے پیش نظر دبستان فلم کے صرف ایسے شعرا کی فلمی مصروفیات کے ساتھ ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے امام الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور نہایت عجز و انکسار اور جذب وکیف کے ساتھ نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

کتاب کے بالاستیعاب مطالعے سے معلوم ہوتا ہے اکرم کنجاہی کٹھنائی کے منطقے میں کشش کا سامان دیکھنے کے خوگر ہیں۔ یوں مشکل کو سہل کرنے میں انھوں نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مختلف اردو فلموں میں شامل نعتیہ متون کو 'واگزار' کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر وہ سوچ سمجھ کر یہ انفکاک یعنی 'جدائی' عمل میں نہ لاتے تو بہت امکان تھا کہ فلمی کونٹیکسٹ حاوی ہو کر اس کتاب کو گویوں، سازندوں اور پروڈکشنز کی تاریخ بنا دیتا۔ مصنف ایک زیرک نقاد ہیں، بھلا وہ اس فروگزاشت کے مرتب کیسے ہو سکتے تھے!

اکرم کنجاہی نے اس نازک جادے کا راہی ہو کر اُس تقدیس کے زجاج کی نگہداشت کا حق ادا کر دیا ہے جو یقیناً اس کا اساسی مقتضا تھا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نقد کے جوہر نے 'سیاق وسباق' کو اپنی معین حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیا۔ اب نعت اور ناعت علی الترتیب پہلے درجے میں ہیں۔ باقی جو کچھ ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں مگر وہ معلومات کے مدار میں جذب ہو کر قاری کے ذہنی افق کو وسعت آشنا کرنے کی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔

متذکرہ جہت کو اس کتاب میں مرکزی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس کے مصنف اکرم کنجاہی خود شاعر اور نقاد ہیں، سو، ان کا شعور نعت تربیت یافتہ اور بالیدہ ہے۔ وہ قاری تک تفصیلات ضرور پہنچاتے ہیں لیکن انھوں نے ہر قدم پر یہ بھی باور کرایا ہے کہ ان کی Domain یہیں تک نہیں۔ آپ اس دستاویز کا مطالعہ کرتے جایئے، آپ کی مدرکہ خود گواہی دیتی جائے گی کہ لطیف تر تجزیے کا مقیاس متواتر فعال ہے۔ یعنی مصنف حزم واحتیاط کے ساتھ

نعوت کو تعینات کے عمل سے برابر گزار رہے ہیں: ''ہمارے ہاں نعت گو کچھ نیا مضمون یا چونکا دینے کے لیے بعض حیران کن مضامین باندھتے ہیں۔ خاص طور پر واقعۂ معراج کے حوالے سے ہماری نعوت میں عجیب عجیب مضامین ملتے ہیں۔۔۔معراج کے موقع پر تصوراتی و خیالی منظر کشی۔۔۔ خلاف حقیقت ہے۔'' انھوں نے یہ رائے دیتے ہوئے قرآن کو کسوٹی بنا کر اپنے فہم دین کی سرفرازی خوبی سے ظاہر کر دی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اکرم کنجاہی نے فلموں میں شامل منظوم توصیفِ پیمبرؐ کو ایک اور طرح کی Contextualization سے ہمکنار کر دیا ہے۔ یہ قدم اس لیے ضروری تھا کہ انھیں نعتیہ ابیات کا تقدس سب سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان نعتیہ زمزموں سے منسوب محاضرات کی ثانویت ہی نے ان صفحات کوئی معنویت بخشی ہے کہ اب سیاق فلمی سے علمی ہو چکا ہے۔ مخصوص مواد کی جمع کاری کے بعد تجزیہ وتنقید کے پیمانے سرگرم ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ بلاشبہ نعت جوہری سطح پر عقیدت کی مظہر صنفِ سخن ہے۔ یہاں منعوت کی پاکیزہ ذات کے ساتھ وابستگی جذبہ واحساس کو امام تسلیم کرتی ہے۔ بقول شخصے: ''نعت حضورؐ کی ذاتِ ستودہ صفات سے قلبی تعلق کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔'' عین اسی مقام پر ایک ہوشمند پارکھ 'بے سمتی' کو نشان زد کر کے گویا قبلے کو درست کر دیتا ہے۔

اکرم کنجاہی کے پیہم تفحص اور مطالعے نے جو فکری ترفع عطا کیا ہے، اسی کو وہ یہاں بروئے کار لا کر سرخرو ہوئے ہیں۔ اس مناسبت سے: صہبا اختر کا مدینۂ نعت' بار بار پڑھے جانے کے لائق مضمون ہے۔ اس اعلا تحریر میں اعتقاد اور انتقاد کا امتزاج قاری کے لیے درِ دلکشا کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنے والے نے زمامِ شوقِ نقد کو تھمانے کی بجائے اعتدال وتوازن سے معمور اظہار کو منور نظیر بنا دیا ہے۔ نعت نگاری کرتے ہوئے صہبا اختر اپنی سادگی میں اگر تعلی کے دام سے دامن نہ بچا سکے تو اکرم کنجاہی ہرگز طیش میں نہیں آئے۔ ان کی بصیرت نے غایت بے ساختگی کے ساتھ نعت کے معیارات کو ذہن نشین ہی نہیں جزوِ شعور بنا دیا ہے: ''انکسار اور کم مائیگی کا اظہار تقدیسی ادب کی

شرط اولین ہے۔(صہبا) نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یکتائی اور انفرادیت کو اپنی تنہائی کے ساتھ ملا رہے ہیں۔ یہ غور کا مقام ہے(یہ روا نہیں کہ) نبیؐ کی انفرادیت سے اپنی تنہائی کا موازنہ کیا جائے۔''

اس بیانیے میں تلخی نہیں، کو ملتا ہے۔ یوں اخلاص متکلم ہو کر رہنما ہو جاتا ہے۔ یہ محض ایک نمونہ ہے وگرنہ پوری کتاب اسی محبت آمیز اور شایستہ اسلوب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ دورانِ مطالعہ رومی یاد آتے رہے: 'علم را برتن زنی مارے بود۔علم را بہ دل زنی یارے بود'۔

یوں تو زیرِ نظر کتاب کی ساری تبویب ہی دانائی کی ترجمان ہے لیکن پہلے باب کی علمی اہمیت علاحدہ اختصاص رکھتی ہے۔ اس تمہیدی تحریری کا عنوان ہے: 'گیت اور گیت نگاری کا ارتقا'! یہ مبسوط نگارش گیت سے وابستہ فنی و تکنیکی مباحث کی روایت کا فشردہ ہے۔Etymological Study سے لے کر دیگر تسمیوں: خیال، ٹھمری، دادرا، غزل، سرگم، تروٹ، قوالی، چترنگ، سادھرا، ہوری____ قلبانہ، منڈھا، ٹپا، دھرپد، ترانہ، سپت، زھیروک، لئیکو، موتک، جگنی، سوت، نازنیک، لیلو/لوری۔۔۔کی ترنم میں اسارت اپنی جگہ؛ اس کی تدریجی مسافرت کا مفصل بیان بھی اپنے مقام پر؛ غنائی لہجوں کی امین راگ راگنیوں سے سنگت کی بدولت پروان چڑھنے کی داستان بھی اپنے محل پر؛ اس کے ساتھ ساتھ میراجی کا یہ کہنا: ''پہلے آواز بنی، آواز کا اتار چڑھاؤ سُر کہلایا، سروں کے ملاپ سے بول نے جنم لیا اور پھر راگ ڈوری میں بندھ کر بول گیت بن گئے۔''

لیکن جو مضمون ان اوراق میں نقش ہوا ہے وہ فی الاصل اگلے پڑاؤ کے ساتھ بلاواسطہ انسلاک قائم کرتا ہے، جس کا سرنامہ ہے: 'بکل اتساہی کی تقدیسی گیت نگاری'! مصنف کے الفاظ میں:''ان کے گیتوں کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ گیت نگاری کے عمل نے بھی یہ اعزاز پا لیا کہ وہ بھی تقدیسی ہو گیا کیونکہ ان کے بہت سارے گیت مذہبی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔'' یہ تصریح جواز سے تہی نہیں ہوگی کہ مذکورہ مقدمہ گیت کی قریبی مقامی روایت کا پیش کار ہے وگرنہ عہد نامہ عتیق

میں داوٗدؑ کے نغمے اور غزل الغزلات کا حصہ بھی اسی کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ ماضی کے مزمور/ مناجات تو اپنی جگہ، جہانِ فردا میں منتظر 'مزامیر' کی ترغیب بھی ہمارے ہاں کوئی اجنبی وعدہ نہیں۔ موسیقی اور مذہب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے مطابق: '' دینی امور میں سب سے زیادہ جوش اظہار عبادت میں ہوتا ہے اور دنیوی امور میں عشق و محبت میں۔ اسی لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گانے کی ابتدا عبادت اور عشق سے ہوئی۔'' بہرصورت بیکل اتساہی کی بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کی گئی ثناخوانی نے نعت کو آہنگ فراہم کر کے اسے 'گیت' کے زمرے میں داخل کیا۔ اب سخن اور لحن کے ملن سے وجود پایا ہوا جادو کب گریزاں ہونے دیتا ہے کہ روح میلوڈی سے قطرہ قطرہ زیست کشید کرتی ہے: ''موسیقی حسنِ سمع کے ذریعہ روح کو اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ خود فراموشی اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔''

ڈاکٹر عاصی کرنالی کے الفاظ میں: ''ہماری شعری روایت میں غنائیت کا ایک خاص مقام ہے۔ لفظوں کا حسنِ انتخاب اور شعر میں ان کی تنظیم، نیز بحور کا چناؤ اور مختلف مصرعوں کے اختصار و طوالت میں ایک خاص حسن توازن، یہ ساری باتیں مل کر غنائی نظام قائم کرتی ہیں۔'' اس طرح نعت میں موجود صادق احساسات الاپ میں جذب ہو کر رفتہ رفتہ سماعتوں کو مسحور کرتے چلے گئے۔ کتاب کے باقی تمام اجزا مزبور پس منظر میں اپنی وقعت کے لیے فضا مہیا کرتے ہیں۔ تحقیق کو اس منہاج کے توسط سے مضبوط تکنیکی، فنی اور موضوعی بنیادیں دے کر مصنف نے اسے تذکرہ نگاری کی سطحیت سے صاف بچا لیا ہے۔ اب یہ کاوش ایک موقر تحقیقی تنقیدی حوالہ ہے۔

کتاب کے مندرجات پڑھتے ہوئے فراخی کا احساس ہوتا ہے۔ اکرم کنجاہی نے ان غیر مسلم شاعروں، گلوکاروں اور موسیقاروں کا بے تعصبی سے ذکر کیا ہے جنھیں فروغ نعت کی سعادت میسر آئی۔ اسی طرح ترقی پسند شعرا کے خراجِ تحسین سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ گویا کتاب میں کسی روایتی مسلک کو تحت الشعور میں بھی فوقیت نہیں دی گئی۔ صرف اور صرف صداقت کی پیام بر نعت سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ کو ترجیح بنایا ہے۔

یہ کتاب ایک مستند ادیب نے لکھی ہے، اس لیے وہ جمالیات کہیں منہا نہیں ہوئی جو پہلے خود لیکھن کو موہنے شبدوں کی ڈور سے باندھتی ہے پھر خوانندہ کے دھیان کو گروی رکھ لیتی ہے۔ یہ راقم کا ذاتی تاثر ہے کہ چوبیس (۲۴) شعرا کے لیے الگ الگ جاذب عنوان تادیر وادیٔ خیال کو مہکاتا رہا۔ آخر میں ان دمکتے نگینوں کی ایک جھلک آپ کے آئینۂ ابصار کی نذر: کرم گستری کا متمنی آرزو اکبرآبادی، یزدانی جالندھری کا چمن زار نعت، شکیل بدایونی کا نغمۂ فردوس، بندۂ بے دام ظہیر کاشمیری، سرور بارہ بنکوی کی چشم شوق۔۔۔

باقی آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ اس مقالے کا موضوع اپنے بطن میں مزاجاً 'کشش و گریز' کی صورت حال لیے ہوئے ہے۔ یوں اس سے عہدہ برآ ہونا کارے دارد تھا۔ مکرم اکرم کنجاہی نے اس عاجز کی دانست میں بروقت اور درست فیصلہ کیا یعنی 'گرے ایریا' میں رہ کر یہ کتاب لکھی۔ اسی لیے قارئین سے بھی توقع ہے کہ وہ بلیک یا وائیٹ میں سے کسی ایک پر رسمی اصرار نہیں کریں گے۔ رہا مسئلہ 'خذ ما صفا و داع ما کدر' پر عامل ہونے کا، تو اس میں ہر فرد آزاد ہے۔ اضافیت کے عصا نے سدا ادراک کو وسعت عطا کی ہے۔

اکرم کنجاہی صاحب! لکھتے رہیے کہ آپ کو پڑھنے سے وجود میں نشاط جذب ہونا چاہتی ہے!!

جمیل احمد عدیل

۲۶/اکتوبر۲۰۲۲ء

معروضات (عرضِ مصنف)

میری ڈیڑھ درجن کے قریب کتب اشاعت پذیر ہو چکی تھیں۔اُن میں ایک کتاب ''غزل کہانی'' بھی تھی جسے پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے بہترین کتاب (۲۰۲۰ء) کا ایوارڈ ملا تھا۔وہ کتاب بھی اُن کے مطالعے میں آئی۔ایک روز اُنہوں نے مجھے فون کیا۔دورانِ گفتگو اِس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ''غزل کہانی'' کی طرز پر ایک مختلف نام سے ''نعت کہانی'' بھی تحریر کروں۔اگرچہ میری طبع شدہ کتب میں زیادہ تعداد تحقیقی وتنقیدی کتب کی تھی مگر تقدیسی ادب پر میرا مطالعہ ہی قابلِ ذکر تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اِس سے متعلق سوچا تھا۔البتہ گئے وقتوں میں ایک دو نعتیہ مجموعہ ہائے کلام پر مضامین ضرور تحریر کیے تھے۔اسی سلسلے میں مجھے مزید دو مرتبہ اُس گراں قدر شخصیت کا فون آیا تو میں نے وعدہ کر لیا۔اپنی ذاتی لائبریری میں تقدیسی ادب کی کتب کا اضافہ کیا جس میں اُنہوں نے میری بہت مدد اور رہنمائی کی۔میں نے اُس سارے مواد کا دل جمعی سے تجزیاتی مطالعہ کیا۔بعد ازاں اللہ کریم اور اُس کے حبیب سے مدد کے التجا کے بعد لکھنا شروع کیا۔اِس طرح ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔نعت نگاری کی تحقیق وتنقید پر یہ میری دوسری کتاب ہے۔مزید دو کتب پر کام تکمیل کے قریب ہے۔مجھے یہ راستہ دکھانے والی شخصیت جناب سیّد صبیح رحمانی کی ہے۔نعت خوانی،نعت نگاری اور تقدیسی ادب کے تحقیق وتنقید کی تاریخ اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔اِس کتاب کے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کا سبب وہی ہیں۔لہٰذا سپاس گزاری مجھ پر واجب ہے۔میرے صاحبِ اسلوب دوست جناب پروفیسر جمیل احمد عدیل نے ہمیشہ کی طرح نہایت عالمانہ دیباچہ تحریر کر کے مجھے عزت بخشی اور کتاب کی توقیر میں اضافہ کیا ہے۔اُن کا بھی شکر گزار ہوں۔

گیت اور گیت نگاری کا ارتقا

لطیف انسانی جذبے کو رَس میں تبدیل کر کے، عوام و خواص کو متاثر کرنے والی صنف ادب ''گیت'' خالص مقامی ہے۔ یہ اُردو میں ہندی شاعری کے اثر سے وجود میں آیا۔ گیت سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی راگ، سرود، بھجن اور نغمہ کے ہیں۔ گیت نہ صرف یہ کہ کسی خاص موضوع یا ہیئت کے پابند نہیں ہوتے بلکہ مصارع کا طول، اشعار کی تعداد اور ترتیبِ قوافی سب کچھ شاعر کی منشا پر ہوتا ہے۔۔ڈاکٹر عطش درانی نے اپنے ایک مضمون ''گیت، حمد، نعت'' میں سانیٹ سے اِس کی نسبت قائم کرنے کی بے سود کوشش کی۔ مجھے اِس بات کی بھی سمجھ نہیں آئی کہ جب وہ حمد و نعت کو بھی گیت قرار دیتے ہیں اور فلمی گیت نگاروں کا ذکر بھی کرتے ہیں تو پھر انہیں یہ کیوں کہنا پڑا کہ'' اُردو میں اچھے گیت بہت کم ہیں''۔ یہ گائی جانے والی صنف ہے اِس لیے خیال، ٹھمری، دادرا، غزل، سرگم، تروٹ، قوالی، چترنگ، سادھرا، ہولی سب کو گیت ہی کہا جاتا ہے۔ گیت موسمی، ماتمی، خانقاہی، سنسکاری، تقریباتی، مذہبی، قومی و ملی، عشقیہ کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ گیت میں داخلی سطح پر محبوب مرد اور عاشق عورت ہوتی ہے۔ جس میں عاشق یعنی عورت اپنے محبوب یعنی مرد سے جذبۂ محبت، نغمگی، نسوانیت، غنائیت اور ترنم ریزی کے ساتھ والہانہ انداز میں اپنے عشق کا اظہار کرتی ہے۔ گویا اصل گیت وہ ہے جس میں ہجر نصیب عورت برہ کے درد کو پروتی ہے اور اپنے جذبات کو بیان کرتی ہے گویا کہ یہ عورت کے فراق کے جذبات ہیں۔

مگر ایسا بھی نہیں کہ گیت صرف ان ہی موضوعات کے لئے ہوتے ہیں گیت میں خارجی جذبات و احساسات شامل ہونے کی وجہ سے، موضوعات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔ عشق و محبت، عبادت و ریاضت، تصوف، رزم، بزم غرض وہ ہر شے جو انسانی فکر و احساس کا حصہ ہے گیت میں اس کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ صوفیائے کرام نے انہیں گیتوں سے مذہب کی ترویج و ترقی کا کام لیا۔ کبھی گیت اظہارِ ذات کا ذریعہ بنے تو کبھی ان میں آزادی کے ترانے گائے گئے اور کبھی ان ہی گیتوں سے ملک کی سرحدوں پر تحفظ کرنے والے فوجیوں میں ملک کی حفاظت کے لئے جذبات کو پُر جوش کرنے کا کام لیا گیا۔ اور کبھی یہی گیت فلم سازوں کو خوب خوب راس آئے

اور انہوں نے ان ہی گیتوں کی مدد سے اپنے فن کو کمالِ عروج پر پہنچایا اور کبھی یہی گیت مذہبی جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ بنے ۔یوں گیت خارج سے داخل کا سفر ہے۔دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کی طرح، اپنے ارتقائی سفر میں گیت نے بھی اپنی زبان بدلی اور ساتھ ہی ساتھ ترقی بھی کی، اِس میں جاذبیت، رعنائی اور حسن پیدا ہوا اور گیت زیادہ نکھری نکھری اور ستھری صورت میں ہمارے سامنے آئے

گیت کی کوئی خاص ہیئت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کسی بھی ہیئت میں لکھا جا سکتا ہے۔ ویسے عموماً گیت کا مکھڑا ہوتا ہے جو دراصل گیت کا پہلا شعر یا پہلا مصرع ہوتا ہے۔اس کے بعد گیت کے کچھ بند ہوتے ہیں جن کی تعداد عموماً چار یا پانچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔۔ ہر بند میں چار چار مصرعے ہو سکتے ہیں تو کسی گیت میں تین تین مصرعوں کے بند بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر بند کے بعد گیت اپنے مکھڑے کو دہرانے کے لئے فضا ہموار کرتا ہے۔

کہیں کہیں تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ہر بند کے بعد مکھڑے کا ہم قافیہ مصرع نہیں ہوتا بلکہ اس کی جگہ مکھڑا ہی کو دہرایا جاتا ہے۔گیت کسی بھی بحر میں لکھا جا سکتا ہے لیکن عموماً چھوٹی بحریں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔کبھی کبھی گیت کا مکھڑا ایک بحر میں اور بول مختلف بحر میں ہوتے ہیں۔گیت کے تمام بند خیال یا مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔غزل کے برعکس گیت میں مکھڑا، ٹیپ یا استھائی کا مصرع ہوتا ہے جس کی تکرار گیت میں وحدتِ تاثر یا ایک ہی فضا پیدا کرتی ہے۔اس لئے بھی کہ پورے گیت میں ایک ہی خیال کو پیش کیا جاتا ہے۔گیت کی ہیئت غزل کی ہیئت کی نسبت بہت لچک دار ہوتی ہے۔ اس کا مکھڑا ایک مصرعے کا بھی ہوسکتا ہے یا ایک شعر پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے۔

غزل کی طرح گیت بھی شاعری کی ایک داخلی اور غنائی صنف ہونے کی وجہ سے شخصی جذبات و احساسات کا بے تکلف اور والہانہ اظہار ہوتا ہے۔گیت میں محبوب سے جدائی کی تڑپ اور وصال کی آرزومندی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ان معنوں میں گیت ایک فراق زدہ عورت کے

دل کی صدائے پُرسوز ہے۔ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ جب مرد عورت سے یا عورت سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو غزل ہوتی ہے اور جب عورت مرد سے متعلق اپنے محبت افروز جذبات کا اظہار کرتی ہے تو گیت جنم لیتا ہے۔ گیت وہی زندہ رہے ہیں جو دل کی بھٹی میں جلے، آنسو بن کر آنکھ سے ٹپکے ہیں اور اہلِ دل نے سدا محبت سے انہیں گایا۔ جب دل میں محبت کا بیج نمو پانے لگتا ہے تو گیت بنتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ضرور ہے کہ گیت تخلیق تو مردوں ہی نے کیے ہیں مگر ابتدائی طور پر ہندی شاعری میں یہ صنفِ نازک کے جذبات ہوا کرتے تھے۔ چونکہ گیت اور سنگیت کا چولی دامن کا رشتہ ہوتا ہے اس لئے سازوں کی آمیزش گیت کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ یوں یہ سرتاپا ایک جمالیاتی صنفِ سخن ہے۔

گیت اتنے ہی قدیم ہیں جتنی اُردو زبان۔ اردو میں گیت کی روایت امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کے عہد سے مانی جاتی ہے۔ اُن کا کلام گیتوں، دوہوں اور کہہ مکرنیوں کی صورت میں زیادہ ہے۔ وہ راگ راگنیوں سے خوب واقف تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا سے بڑی قربت تھی۔ امیر خسرو نے راگ راگنیوں کے ساتھ گیت کو پروان چڑھانے کے لئے راگوں کو ایجاد بھی کیا۔ امیر خسرو کے عہد سے تا حال اردو میں جو گیت لکھے گئے اس کا خاص موضوع عشق ہے۔ جدائی، غم اور ملن کی خوشی سے ہمارے گیت بھرے پڑے ہیں۔

گیتوں کا سرچشمہ لوک گیت کہے جا سکتے ہیں جو سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہیں۔ تجربے کی بھٹی میں پکتے ہیں۔ اُن کے خالق سے متعلق عمومی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ برصغیر کے قدیم گیتوں میں چکی نامے اور لوریاں اہم ہیں جو نہ صرف دکنی ادب میں موجود تھیں بلکہ پنجاب میں بھی اُن کا خاصا رواج رہا۔ چکی نامے عمومی طور پر مذہبی رنگ لیے ہوتے تھے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کلام سے چکی نامہ کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

دیکھو واجب تن کی چکی   پیو چاترا ہو کے سکی
سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی   کہے یا بسم اللہ ہو، ہو، اللہ

چرخہ نامہ، قیامت نامہ، معراج نامہ اور میلاد نامہ، جھولنہ اور پنکھا نامہ بھی اسی ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عورتیں بچوں کو سلاتے وقت جو گیت گاتی تھیں وہ لوری کہلاتا تھا اور اُس کا رواج آج بھی موجود ہے۔ ماں کی زبان سے ادا ہونے والا یہ گیت دنیا کا سب سے میٹھا اور رسیلا گیت کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں فقیر لوگ بھی مختلف تہواروں کے موقع پر بچوں کو اٹھا کر انہیں لوریاں دیتے ہیں۔ دکن میں بہمنی عہد اور اس کے بعد قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء۔۱۶۸۷ء) کے سلطان قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور اُن کے دربار سے منسلک شاعر ملا جہی کے ہاں دیسی مقامی رنگ، بسنت، عشق اور ہجر کے مضامین عام تھے۔ عادل شاہی حکومتوں کے دور میں بھی دکنی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اسی لیے اس دور کی غزلوں میں گیتوں کا رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس دور کے بعض شعراء کے یہاں ایسی تخلیقات ملتی ہیں جن کو ہم اردو گیت کے ابتدائی نمونے کہہ سکتے ہیں جن میں اُس دور کے تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور موسموں کا خوب ذکر ہوا کرتا تھا۔

دلی میں محمد شاہ رنگیلے (۱۷۰۲ء۔۱۷۴۸ء) کے دربار میں راگ رنگ کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ محمد شاہ رقص و موسیقی کے ساتھ گیت نگاری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ محمد شاہ رنگیلے اور ان کے دربار سے وابستہ شاعروں نے زیادہ تر ٹھمریاں، خیال اور دادر جیسی چیزیں لکھیں جو مختلف راگوں پر گائے جانے کے لیے تھیں۔

نظیر اکبرآبادی کا نام اردو گیت کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ انہوں نے مختلف موضوعات کو اپنی نظموں میں باندھا ان کی طویل نظموں میں گیت کی کیفیت نظر آتی ہے۔ واجد علی شاہ کے دربار کی کیفیت بھی کم و بیش وہی تھی۔ انیسویں صدی کے آتے آتے امانت کی اندر سبھا سے اردو گیت کا احیا ہوا۔ ریاست اودھ کے واجد علی شاہ کا عہد ۱۰ برس پر محیط تھا جو ۱۸۵۷ء میں انجام کو پہنچا۔ اُسے رقص و موسیقی سے دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی ''رقص'' میں حصہ لیتے تھے۔ اُس کے گیتوں میں موسیقی کے دھنوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے گیتوں میں شاعرانہ خوبیاں زیادہ نظر آتی ہیں اور ساتھ ہی ان کے گیتوں پر عیش

پرستی کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

اسی دور میں امانت لکھنوی (۱۸۱۵ء۔۱۸۵۹ء) نے (۱۸۴۸ء) میں منظوم ڈرامہ ''اندرسبھا'' تخلیق کیا جو عوام وخواص میں بے حد مقبول ہوا۔ اِس ڈرامے کی خاص بات گیتوں کی پیش کشی تھی۔ ڈراموں کے کردار گیتوں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار زیادہ بہتر اور موثر طور پر کر سکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرسبھا کے ذریعہ اردو گیتوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اندرسبھا کا پس منظر چوں کہ ہندوستانی اساطیر سے ماخوذ تھا۔ اسی لیے اندرسبھا کے گیتوں پر بھی ہندی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اندرسبھا میں کل (۴۷) گیت ہیں۔ امانت، مداری لال اور آغا حشر کاشمیری اس سلسلے میں قابلِ قدر ہیں جنہوں نے گیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے دیگر اصنافِ ادب کے ساتھ ساتھ خالص دیسی گیت بھی لکھے۔ جن میں ہجر وفراق کی کیفیات کو غم ناک اسلوب میں بیان کیا گیا تھا۔

عظمت اللہ خان (۱۸۸۷ء۔۱۹۲۷ء) نئے دور کی شاعری میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ عروض کو ترنم کا اصلی گُر خیال کرتے تھے۔ اُن کے گیتوں کی کتاب ''سریلے بول'' ظاہر کرتی ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نہ صرف عروض کا خیال رکھتے ہوئے بلکہ ہندی و فارسی الفاظ کے استعمال سے غنائیت سے بھر پور گیت تخلیق کیے۔ انہوں نے ہندی اور اردو کے الفاظ کے امتزاج سے گیتوں میں خوب خوب مٹھاس پیدا کی۔ اُن کی نظمیں بھی گیت نما تھیں جن میں انہوں نے عورتوں کی مظلومیت بیان کی۔

۲۰ ویں صدی کے آتے آتے گیت نگاری میں اسلوبِ بیاں اور مضامین کے اعتبار سے ایک نیا موڑ آیا۔ گیت نگاری نئی رفعتوں اور رعنائیوں سے آشنا ہوئی۔ لا تعداد گیت نگار سامنے آئے جنہوں نے اپنے اپنے رنگ اور ڈھنگ میں گیت کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ حفیظ جالندھری کی وجۂ شہرت جہاں قومی ترانے اور شاہنامہ اسلام کی وجہ سے ہوئی وہیں اُنہوں نے دیگر اصنافِ ادب کے ساتھ ساتھ گیت نگاری میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی۔ حفیظ کا عہد سیاسی،

سماجی اور معاشرتی بیداری کا تھا۔ اس وقت ادب کی فضاء قومیت، حریت اور آزادی کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ لہذا اُنہوں نے بھی حریت، آزادی اور قومیت کے جذبات سے بھرپور گیت لکھے جو ہماری قومی و ملی تاریخ میں یادگار ہیں۔ اختر شیرانی ہماری ادبی تاریخ کے اہم ترین رومانوی شاعر ہیں۔ اُن کے گیتوں میں ہجر و وصال کی کیفیات نمایاں ہیں۔

میراجی کے گیتوں میں ہندی آہنگ اور لفظیات کا استعمال بھرپور ہے۔ وارفتگی اور سپردگی ہے۔ ہجر کی تڑپ ہے۔ وہ فرانسیسی علامت نگاری کے علاوہ ہندوؤں کے وشنو عقائد کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ میراجی کا خیال تھا کہ پہلے آواز بنی، آواز کا اتار چڑھاؤ سُر کہلایا، سُروں کے ملاپ سے بول نے جنم لیا اور پھر راگ ڈوری میں بندھ کر بول گیت بن گئے۔ اُن کے گیتوں میں پوری طرح تخلیقی عمل کا عکس ابھر کر سامنے آتا ہے۔ دراصل میراجی کی گیت نگاری سے یہ احساس ہوتا ہے کہ میراجی کو گیت سے ایک فطری مناسبت تھی۔ حلقہ اربابِ ذوق میں میراجی کے ساتھی قیوم نظر نے بھی نہایت سادہ، جذبات و تاثر سے بھرپور دل کش گیت لکھے۔

مصطفیٰ ﷺ نے میرے مولا یہ کرم فرمائی کی
ہر زمانے کو خبر دی ہے تری یکتائی کی
(اکرم کُنجاہی)

بیکل اُتساہی کی تقدیسی گیت نگاری

بیکل اتساہی کے گیتوں میں مقامیت، ہندوستانی تہذیب و معاشرت، ادبی تاریخی شعور سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔اُن کے ہاں اپنی مٹی کی بو باس پورے وسیب کے لوازمات کے ساتھ موجود ہے۔ جدید عہد کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اُن کے گیت جب برہ کی شاعری سے آگے بڑھے تو موضوعات کی گونا گونی کے قیمتی موتیوں سے اپنا دامن بھر لیا۔اُن کے ہاں اودھی زبان کی محبت کا کھرا پن اور ہندی اُردو کا شیریں اور میٹھا امتزاج ہے۔اُن کے گیتوں کی یہ دولت یہ ممکن ہوا کہ گیت نگاری نے بھی یہ اعزاز پالیا کہ وہ بھی تقدیسی ہو گیا کیوں کہ اُن کے بہت سارے گیت مذہبی جذبات کے ائینہ دار ہیں کہ اُن میں شاعر نے سرور دو جہاں ﷺ کی شان میں ثنا خوانی کا شرف حاصل کیا ہے اور ایک متبرک فریضہ سرانجام دیا ہے۔بیکل اُتساہی کا ایک اہم موضوع وطن کی محبت بھی ہے جو ''یادِ وطن'' کے نام سے اُن کے گیتوں سے مترشح ہے۔ اُن کی نعوت،سلام،مناقب،قصائد،نظموں،غزلوں اور گیتوں میں فطری مناظر سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔

پہلے وہ بیکل وارثی تھے۔انڈیا کے پہلے وزیر اعظم کے سامنے ایک نظم 'کسان بھارت کا' پڑھی اور اس قدر جوش کے ساتھ پڑھی کہ جواہر لال نہرو یہ کہہ اٹھے کہ 'یہ ہمارا اُتساہی (جوشیلا) شاعر ہے۔ یوں بیکل وارثی بیکل اتساہی بن گئے۔وہ اتر پردیش کے قصبے بلرام پور میں یکم جون 1928ء میں پیدا ہوئے تھے۔گیت،دوہے،ہائیکو،غزل اور دیگر اصناف میں شاعری کی۔بیکل اتساہی کا آخری مشاعرہ سرزمین اجمیر میں ہوا جمعتہ علماء ہند کے زیر انتظام ہونے والا عالمی نعتیہ مشاعرہ 2016ء تھا۔

بیکل اُتساہی کے نعتیہ مجموعے ''سرورِ جاوداں'' میں ''گیت اور نظمیں'' کے عنوان کے تحت بہت سی نعتیہ نظمیں ،نعتیہ گیت یا گیت نما شامل ہیں ۔ مذکورہ بالا کتاب میں ہئیت کے حوالے سے غزلیہ نعتیں،ایک آدھ دوہے،نعتیہ مسدس،مخمس،قطعات،نعتیہ گیت یا گیت نما شامل ہیں۔یہ نعتیہ نظمیں یا گیت مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ مبسوط بھی ہیں۔

گیت نما ''مسکرادو تو عالم بدل جائے گا'' پانچ پانچ مصارع کے بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ اور ہر بند کا پانچواں پانچواں مصرع آپس میں ہم قافیہ ہیں۔ پھر ہر بند کے بعد استھائی کی تکرار ہے۔

گیت نما ''وجہِ کُن'' میں استھائی ''آپ نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے'' کی تکرار ہے۔ ہر بند میں مصارع کی تعداد اور ترتیب قوافی مذکورہ بالا گیت ہی کی ہے بلکہ بیکل نے زیادہ تر گیتوں میں اسی ترتیب کی پیروی کی ہے۔ اسی طرح گیت نما ''حبِ نبی ﷺ'' میں استھائی ''لذّتِ یادِ نبی، ذکرِ نبی، حبِ نبی۔۔۔تو نہیں ہے تو دو عالم میں کوئی چیز نہیں'' کی تکرار ہے مگر گیت نما ''سندیسہ'' میں استھائی ''نگریا جن کی نور بھری، سُن ری پُروابیا'' کی دو دو مصرعوں کے بند کے بعد تکرار ہے۔ ہر بند کے یہ دو دو مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہیں۔

آٹھ بند کی ایک مبسوط گیت نما کے چند بند ملاحظہ فرمائیے کہ بیکل نے کس عمدہ اسلوب میں نبی ﷺ کی مسکراہٹ کو موضوع بنایا ہے۔ اِس گیت نما میں مناظرِ فطرت سے کام لیتے ہوئے رسول اللہ کی مسکراہٹ کی شان بیان کی ہے، آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم بیکل کو حالی کے مکتبِ فکر سے بھی ملا رہی ہے کہ ناعت نے امت کے اجتماعی دکھ درد بھی بیان کیے ہیں کہ کفر و ظلمت کی تاریکی امت پر مسلط ہے، حضور ﷺ آپ مسکرا دیجیے کہ آپ کی مسکراہٹ آفتاب کی کرنوں کی صورت اندھیروں کا سینہ چیر سکتی ہے :

ساقیِ حوضِ کوثر حبیبِ خدا مونسِ بیکساں حشر کا آسرا
اے چٹائی نشیں اے شہِ دوسرا سرورِ انبیا احمد مجتبےٰ ﷺ
گیسوؤں والے ، اے کملی والے سجن
مسکرا دو تو عالم بدل جائے گا
یہ مہکتے ہوئے گل چمن در چمن
گلاب اور یہ نرگس و نسترن

سبزہ زاروں کی رعنائیوں کی پھبن
لے اڑی ہو صبا بوئے مشکِ ختن
یہ پپیہا وہ کوئل ہوئی نغمہ زن
مسکرا دو تو عالم بدل جائے گا
دونوں جگ سے سگھرا آمنہ کا للن
چومیں چاند و سورج جن کے کومل چرن
جھکا مرجھل جھکے خُلد کا بانکپن
جھکی چوکھٹ بہارے ارم کی پون
کہکشاں کہہ رہی ہے یہ ہو کے مگن
مسکرا دو تو عالم بدل جائے گا
لُٹ رہا ہے چمن ، جھومتی ہے خزاں
دین و ملت کے لٹنے لگے کارواں
ہر طرف کفر و ظلمت کا چھایا دھواں
ہر نظر تیرگی ہر قدم آندھیاں
آفتابِ ازل کی ہو پہلی کرن
مسکرا دو تو عالم بدل جائے گا

بیکلؔ اکثر مقطع میں اپنے تخلص کا استعمال بالکل مومن خان مومن کی طرح اس ہنرر مندی سے کرتے تھے کہ وہ شعر کا حصہ بن جاتا تھا محض تخلص نہیں رہتا تھا۔

بیکلؔ ہوں غم عشق میں سر کار ﷺ تمہارے
ہو چشمِ کرم جس سے مری زیست سدھر جائے

اُن کی نعتیہ شاعری اس وقت بامِ عروج پر پہنچی جب بیکلؔ جیل میں اپنی سزا کاٹ رہے تھے کہ ایک رات خواب میں ان کو ایک بزرگ کا دیدار ہوا اور انہوں نے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا ''تم خوش نصیب ہو، تمہاری کامیابی قدم چومنے کے لئے بے قرار ہے، تم کو لیڈری کے علاوہ کچھ اور بھی ضروری کام کرنا ہے۔ وہ سامنے دیکھو'' بیکلؔ نے جب سامنے کی طرف رُخ کیا تو ان کو سبز گنبد کے جلوے دکھائی پڑے۔ یہیں سے ان کی نعتیہ شاعری کا آغاز ہوا، اور یہ اسی آغاز کا انجام آج ہم لوگوں کے درمیان ان کی نعتیہ شاعری سامنے ہے۔

مجموعہ ہائے کلام میں نغمۂ بیکل، حسنِ مجلّٰی، تحفۂ بطحا، سرورِ جاوداں، بیانِ رحمت، جامِ گل، توشۂ عقبٰی، نور یزداں، والضحیٰ، والنجوم، ''موجِ تسنیم''، اور ''نور کی برکھا'' اہم ہیں۔ بیان کی سادگی اُن کے کلام کا خاصہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ غالب و اقبال کو بھی زمینی نہیں آسمانی شاعر کہا کرتے تھے۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دونوں بڑے سخن وروں کے ہاں بوجھل عربی و فارسی تراکیب کی کثرت ہے۔ جب کہ قارئین اور سامعین اُس زبان کی متقاضی ہوتے ہیں جو اُن کی سمجھ میں آ سکے۔ بہر حال یہ اُن کا خیال تھا جس سے بہت سے ناقدینِ فکر و فن کو اختلاف کا حق ہے۔

اُنہوں نے جس قدر شعری اصناف میں اظہار کیا ہے وہ بلا شبہ اُن کی قادر الکلامی کا واضح ثبوت ہے۔ دوسری بات یہ کہ بیکل کے ہاں فن بھی جلوہ ریز ہے اور فکر کی منہاج اور معراج بھی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے اہم نعتیہ شعری موضوعات میں شفاعت، معجزاتِ نبوی، معراجِ مصطفےٰ ﷺ، حیاتِ رسول ﷺ، نورِ مصطفیٰ، اختیاراتِ نبویؐ، قرآنی جملوں کا استعمال، شہرِ طیبہ میلادِ نبی۔ غزل کی ہیئت میں بھی اُن کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں نبی پاک ﷺ کے چہرۂ انور کی تابانیوں، اُن کی زلف و رخسار کے جلوؤں، غلاموں سے لے کر شاہانِ عالم پر اُن کی کرم فرمائیوں، اُن کے کردار کی عظمتوں، گفتار کی سحر آفرینیوں کا بڑے دل کش اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مقطع میں تخلص کا عمدہ استعمال بھی دل موہ لینے والا ہے۔

سرکار دو عالم کے رخ پر انوار کا عالم کیا ہوگا

جب زلف کا ذکر ہے قرآن میں رخسار کا عالم کیا ہوگا
محبوب خدا کے جلوؤں سے ایمان کی آنکھیں روشن ہیں
بے دیکھے ہی جب یہ عالم ہے دیدار کا عالم کیا ہوگا
جب انکے گدا بھر دیتے ہیں شاہانِ زمانہ کی جھولی
محتاج کی جب یہ حالت ہے مختار کا عالم کیا ہوگا
جب ان کے غلاموں کے در پر، جھکتے ہیں سلاطین عالم
پھر کوئی بتائے آقاؐ کے دربار کا عالم کا کیا ہوگا
جب سن کر صحابہؓ کی باتیں کفار مسلماں ہوتے ہیں
پھر دونوں جہاں کے سرور کی گفتار کا عالم کیا ہوگا
طیبہ سے ہوا جب آتی ہے بیکل کو سکوں مل جاتا ہے
اس پار کا جب یہ عالم ہے اس پار کا عالم کیا ہوگا

کوئی خواہش ہی نہیں شمس و قمر ہو جاؤں
دل یہ چاہے رہِ طیبہ کا شجر ہو جاؤں
(اکرم کُنجاہی)

اُردو فلموں میں نعت نگاری

اگر چہ گیت کو دیگر اصناف ادب کی طرح مقبولیت حاصل تو نہ ہو سکی مگر ۲۰ ویں صدی کے اکثر و بیشتر بڑے شعراء نے دوسری تمام اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، نعت، حمد، سلام، منقبت کے ساتھ ساتھ گیت نگاری میں بھی ضرور طبع آزمائی کی ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد دبستانِ فلم کے گیتوں نے البتہ اِس شعری صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اِس کے باوجود کہ کئی ایک شعرا کی تو وجہِ شہرت ہی فلمی گیت ہیں مگر اِس شعبے کو ادب میں خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ گیتوں کو دیگر اصناف کی طرح محفوظ بھی نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گیت نگاری پر ایک آدھ ہی تاثراتی و تنقیدی کتاب ملتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل کی طرح اِس صنف پر بھی ضخیم کتب منظرِ عام پر آ چکی ہوتیں حالانکہ امیر خسرو کے گیت آج بھی رخصتی کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔

گیت نگاری کو حقیقی عروج ۲۰ ویں صدی ہی میں حاصل ہوا ہے۔ اِس عہد میں جن شاعروں نے گیت لکھے ان میں حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، آرزو اکبر آبادی، بہزاد لکھنوی، جاں نثار اختر، جوش ملیح آبادی، حبیب جالب، ، ساغر صدیقی، سیف الدین سیف، یزدانی جالندھری، شکیل بدایونی، ، صہبا اختر، طفیل ہوشیار پوری، قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، کلیم عثمانی، مظفر وارثی، منیر نیازی، ماہر القادری، شاعر صدیقی، ناصر کاسگنجوی اور ولی صاحب کے نام اہم ہیں ۔اِس کتاب کے عظیم موضوع کے تقدس اور آداب کے پیشِ نظر یہاں دبستان فلم کے صرف ایسے شعرا کی فلمی مصروفیات کے ساتھ اُن کے نعتیہ کلام کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جا رہا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جنہوں نے امام الانبیاء ﷺ کے حضور نہایت عجز و انکسار اور جذب و کیف کے ساتھ نذرانہ عقیدت بھی پیش کرنے میں اپنے فکر و فن سے بھرپور کام لیا ہے۔

ہمارے ہاں اگر چہ فلمی دنیا سے متعلق متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک طبقہ ہے جو فلموں اور فلمی گائیکی کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا مگر یہ بھی ایک لافانی حقیقت ہے کہ دبستانِ فلم کے لیے ایسی شخصیات نے بھی گیت نگاری کی کہ جنہوں نے نعت گوئی کی تاریخ میں بھی انمٹ

نقوش چھوڑے ہیں۔مزید برآں ایسے گلوکاروں نے فلموں کے لیے حمدیں،نعتیں اور قوالیاں ریکارڈ کروائیں کہ جن کے ذکر کے بغیر گلوکاری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔آج بھی ہماری دینی محافل اور مساجد میں ایسی نعوت سوز و گداز کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں جو اوّل اوّل کسی گلوکار یا گلوکارہ نے کسی فلم کے لیے ریکارڈ کروائی تھیں۔برصغیر میں ۲۰ ویں صدی کی دوسری دہائی میں جب گراموفون کا آغاز ہوا تو جن لوگوں نے ابتدائی طور پر غزلیں اور نعتیں ریکارڈ کروائیں اُن میں ایک اہم نام کلکتہ کی کملا جھریا کا بھی ہے جنہوں نے برصغیر کی تمام اہم زبانوں میں فلمی گیت گائے۔شاید فلموں نے لیے نعوت تو نہیں پڑھیں مگر کچھ نعتیں گراموفون وغیرہ کے ذریعے سے ریکارڈ ضرور کروائیں۔مثلاً:

یا شاہِ عرب سیّدِ ابرار تمہی ہو
مجھے روئے زیبا دکھا کملی والے
تمرے دیا کی ہے آس محمدؐ

اُن کی ایک معاصر گلوکارہ امیر بائی کرناٹکی نے کئی فلموں کے لیے گیت گائے اُن کی ایک نعت بڑی مقبول ہوئی:

دربارِ محمدؐ پرائے شوقِ جبیں لے چل

اوّل اوّل پاکستان کی فلمی دنیا میں مشہور ہونے والی نعت ۱۹۵۷ء میں گیت نگار تنویر نقوی نے فلم ''نورِ اسلام'' کے لیے لکھی تھی، جسے دف کی تال پر کمپوز کیا گیا اور سلیم رضا، زبیدہ خانم اور ہم نوا نے ریکارڈ کرایا تھا۔اس کے بول تھے:

شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ یثرب کے والی
سارے نبی تیرے در کے سوالی

1960 کی فلم ''ایاز'' میں تنویر نقوی ہی کی لکھی ہوئی نعت ،جس میں حضرت شیخ سعدیؒ کی مشہورِ عالم نعت کے سحر آگیں اشعار شامل کیے گئے تھے۔اس نعت کو زبیدہ خانم، ناہید نیازی اور ہم

نواؤں کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اِس نعت کی تازہ کاری، شیرینی اور دل کشی آج بھی پہلے دن کی طرح ہے۔ سرکارﷺ کی شان کس عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہے۔ آپ کی سادگی، بوریا نشینی اور کرم گستری کا ذکر ہے۔

صد آفرین کہ اس نعت میں ''صلو علیہ وآلہٖ'' ردیف و قافیے سے ملانے کے لئے خوبصورتی سے نبیِ پاکﷺ کیلئے توصیفی الفاظ منتخب کیے گئے ہیں۔ پر اثر الفاظ کا حامل یہ نعتیہ کلام آج بھی سحر انگیز ہے اور لوگوں پر رقت طاری کر دیتا ہے:

جو نہ ہوتا تیرا جمال ہی
تو جہاں تھا خواب و خیال ہی، صلو علیہ وآلہٖ
ماہ و مہر میں تیری روشنی
ہوئی ختم تجھ پہ پیمبری
نہیں تجھ سا تیرے سوا کوئی
کرے کون تیری برابری
یہ نہیں کسی کی مجال ہی، صلو علیہ وآلہٖ
نہ فصیل ہے نہ محل سرا
تیرا فرش ہے وہی بوریا
ترے جسمِ پاک پہ اِک قبا
وہ بھی تار تار ہے جا بجا
تیری سادگی ہے کمال ہی، صلو علیہ وآلہٖ
تو خلیل ہے تو کریم ہے
تو رؤف ہے تو رحیم ہے
تو حبیبِ رب کریم ہے

تیری شان سب سے عظیم ہے
نہیں کوئی تیری مثال ہی، صلوعلیہ وآلہٖ

فلم ''زہرِ عشق'' (۱۹۵۸ء) میں بھی قتیل شفائی کی ایک نعت شامل تھی جسے زبیدہ خانم نے ترنم سے پڑھا تھا:

سنو عرض میری کملی والے
کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے
میرے دل کی لگی کملی والے

فیاض ہاشمی اُن گیت نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے فلموں کے لیے نعتیں اور قوالیاں بھی لکھیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں جن دنوں وہ کلکتہ کی ایک گراموفون کمپنی میں ملازم تھے، اُنہوں نے سات برس کے عرصہ میں خاصے گیت، غزلیں، نعتیں، قوالیاں اور بھجن ریکارڈ کروائے۔ نعت فکری اعتبار سے ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔ یوں لگتا ہے کہ فیاض ہاشمی نے عشق رسول ﷺ کے جذبے کے زیر اثر یہ نعتیں لکھی تھیں۔ وہ آج بھی تر و تازہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی کہ یہ نعت نگاری کی خوبی ہے۔

۱۹۶۵ء میں بنائی گئی فلم ''عید مبارک'' میں میلاد کی محافل کو بھی شامل کیا گیا۔ ہمارے ہاں محافل میلاد میں نعتیں عقیدت واحترام سے پڑھی جاتی ہیں۔ فیاض ہاشمی نے اُس کے لیے تین نعتیں ریکارڈ کروائیں ۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ خاص طور پر فلم ''سرتاج'' کے لیے مالا اور ہم نواؤں کی آوازوں میں ریکارڈ کروائی گئی نعت بے حد مقبول ہوئی۔ اس نعت کے بول تھے:

رحم کرو یا شاہِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
نظرِ کرم یا نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

1964 میں فلم ''توبہ'' میں فیاض ہاشمی کی لکھی ہوئی ایک قوالی
''نہ ملتا گر یہ توبہ کا سہارا ہم کہاں جاتے''

بھی بہت بے مثال قرار پائی۔اسی طرح اولاد فلم میں ایک قوالی بھی فیاض ہاشمی کے قلم کا اعجاز تھی اور سننے والوں پر وجد طاری کر دیتی تھی۔ ''حق لا الہ الا اللہ فرما دیا کملی والے نے''

۱۹۶۴ء ہی میں پیش کی جانے والی فلم (فرنگی) جو ریاض شاہد نے تحریر کی تھی اور وہ ایسی فلمیں بنانے میں کمال ہنرمند تھے، اُس فلم میں نور جہان کی آواز میں قتیل شفائی ایک خوب صورت نعت بھی ریکارڈ کی گئی۔فلم میں یہ نعت چوں کہ سازوں کے ساتھ پڑھی گئی لہٰذا اِس کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی تھی۔اِس نعت کے پہلے دو ٹکڑے ملاحظہ کیجیے:

تیری ذات ہے مظہرِ نورِ خدا
بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
میری بگڑی ہوئی تقدیر بنا
حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ والہ
پھر جینا ہوا دشوار انہیں
قرآن کے جو رکھوالے ہیں
فریاد کریں تو کس سے کریں
جو تیرے چاہنے والے ہیں
غم خوار نہیں کوئی تیرے سوا
حسنت جمیع خصالہ

پاکستان میں سب سے زیادہ غلام فرید صابری، مقبول صابری قوال، عزیز میاں قوال اور نصرت فتح علی خان نے قوالی میں مقبولیت حاصل کی اور ان کی قوالیاں آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔1965 میں ریلیز ہونے والی فلم ''عشقِ حبیب'' میں صابری برادران کی قوالی اپنی مثال آپ ہے۔اُس نے نہ صرف فلم کی شان بڑھائی بلکہ مقبولیت کا بڑا سفر طے کیا کہ اِس میں ایک دکھی

شکستہ دل، درماندہ اور ٹھکرائے ہوئے انسان کے جذبات کی کمال مہارت سے عکاسی کی گئی ہے:

میرا کوئی نہیں ہے تیرے سِوا
مجھے نظرِ کرم کی بھیک ملے
میں یہ جھولی خالی لایا ہوں

''بھیا'' نام سے 1966 میں ایک فلم بنائی گئی جس کی یہ قوالی بہت مشہور ہوئی:

مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا
مدینے سے گزر جب ہو صبا صلِّ علیٰ پڑھ کر
ادب سے روضۂ اقدس کو اُن کے چومنا بڑھ کر
پھر اُن سے دیدہ و دل کا پیام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا
میں خادم ہوں شہِ دیں کا مجھے دنیا سے کیا مطلب
اُن ہی کے جلوے رہتے ہیں میری آنکھوں میں روز و شب
ترستی آنکھوں کا اُن کو سلام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا
سفینہ زندگی کا ہے بھنور میں سخت مشکل ہے
مخالف ہے ہوا، دشمن ہے طوفاں دور ساحل ہے
زباں پر ہے فقط اُن کا ہی نام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا غلام کہہ دینا

اِس نعتیہ قوالی کو شاعر صدیقی نے لکھا۔ غور کیجیے کہ ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ کی اذنِ حضوری کے لیے کیسی ٹرپ اور بے قراری کی عکاسی ہے۔ سیّد ابرار کے سامنے شاعر نے اپنی زندگی

کی مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے اور فریاد کی ہے کہ عاشق حاضری کی اجازت چاہتا ہے مگر سفینے کو بھنور اور طوفان کی ہزار مشکلات درپیش ہیں۔ مدد فرمایئے۔ عام فہم اور میٹھی طرز کی حامل اس قوالی کو احمد رُشدی، مسعود رانا، عطا محمد قوال اور ہمنوا کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔ موسیقی روبن گھوش نے دی تھی۔ مذکورہ قوالی بہت زیادہ مقبول تھی اور آج بھی شوق سے سُنی جاتی ہے۔ شاعر صدیقی پاکستان ٹیلی وژن ڈھاکا مرکز میں اردو گیت وغزل لکھنے سے مشہور ہوئے، نعتیہ کلام لکھ کر انہوں نے بہت داد پائی۔

فلم تصویر (1966) میں مولانا الطاف حسین حالی کی مشہور زمانہ نعت

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

شامل تھی جسے مسعود رانا نے بغیر سازوں کے ترنم سے پڑھا جبکہ فلم ہمراہی (1966) میں بھی مظفر وارثی کی بے مثال مشہور زمانہ نعت

کرم کی اک نظر ہم پر خدارا، یا رسول اللہ ﷺ

اونچی سروں میں پڑھی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب شباب کیرانوی اور ظفر شباب کی فلم ''درد'' جاری ہوئی تو اُس میں ثریا کی آواز میں ایک نعت شامل تھی:

بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ شاہِ مدینہ

۱۹۷۶ء میں فلم سچائی میں ''تیری نظرِ کرم'' قوالی کو اتنی زیادہ شہرت نہ مل سکی، لیکن 1982ء میں بننے والی فلم ''سہارے'' کی قوالی ''تاجدارِ حرم'' نے صابری قوال بھائیوں کی اس جوڑی کو عروج پر پہنچا دیا۔

تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم، ہو نگاہِ کرم
ہم غریبوں کے دن بھی سنور جائیں گے
حامیء بیکساں! کیا کہے گا جہاں
آپ کے در سے خالی اگر جائیں گے

یہ قوالی دراصل مشہور پہلے ہوئی اور بعد میں اسے فلم میں شامل کر لیا گیا تھا، یہ کلاسک قوالی ہر دور کی ہے۔تاجدارِ مدینہ اور تاجدار حرم کے یہ دونوں مرکباتِ اضافی اتنے مقبول ہیں کہ اردو زبان کے کئی فلمی گلوکاروں اور قوالوں نے ان کو نعتوں میں پڑھا ہے۔مثلاً ایک بھارتی فلم میں آشا بھونسلے کی ایک نعت جو''مدد کیجئے تاجدارِ مدینہ'' سے آغاز ہوتی ہے،صوت وصدا کا شاہکار ہے۔اسی طرح غلام فرید صابری اور مقبول صابری کی گائی ہوئی مشہور قوالی''تاجدارِ حرم، ہونگاہِ کرم''، آپ ﷺ کے صدقے ہی سے اتنی مشہور ہوئی کہ ان دونوں کو امر بنا گئی۔اس قوالی میں نہ صرف یہ کہ حضرت وارثی نے عربی، فارسی، اردو اور برج بھاشا کی رباعیات وقطعات استعمال کی ہیں بلکہ جب صابری برادران نے اس قوالی کی دھن ترتیب دی تھی تو وہ خود بھی ساتھ تشریف فرما تھے۔ان چاروں زبانوں کے تلفظ کو صحیح مخرج سے ادا کرنا آسان نہیں۔اس کے لئے جو محنت اور جو ریاض صابری برادران نے کیا اس کی تاثیر آج بھی زندہ ہے اور جب تک قوالی کا دبستان باقی رہے گا، یہ نعتیہ قوالی بھی زندہ و پائندہ رہے گی۔صابری برادران کی آواز میں پُرنم الہ آبادی کی لکھی ہوئی ایک نعتیہ قوالی بے حد مقبول ہوئی:

اسی طرح 1975 میں فلم''بن بادل برسات''میں صابری بردران کی ہی یہ قوالی:

بھر دو جھولی میری یا محمدؐ
لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی

آج بھی بہت شوق سے سُنی جاتی ہے،اس قوالی نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔کچھ عرصہ پہلے ایک بھارتی فلم''بجرنگی بھائی جان'' میں صابری برادران کی یہی لازوال قوالی ''بھر دو جھولی مری۔۔۔'' تھوڑی تبدیلی کے ساتھ مگر کسی اجازت کے بغیر شامل کی گئی جسے عدنان سمیع نے گایا تھا۔جس پر بعد میں معذرت کر لی گئی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی ہر کاوش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے مگر اخلاقی ضابطوں کی پابندی کی جائے۔

بھارتی فلموں میں بھی نعتیہ کلام کے ساتھ قوالیوں کو شامل کرنے کا رواج بہت بڑھ

چڑھ کرتھا۔ دلوں کو گداز کر دینے والی آواز محمد رفیع کی آواز کے ساتھ لتا منگیشکر کی آواز میں کئی فلموں میں نعت وقوالیوں کو شامل کیا گیا، بلاشبہ اس قدر پراثر کلام اور دلوں کو چھو لینے والی دھن آج بھی فلم بینوں کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ محمد رفیع کی دل گیر آواز میں اس نعت کے بول ملاحظہ کیجیے،

اگر کملی والے کی رحمت نہ ہوتی
تو قسمت کے ماروں کا کیا حال ہوتا
رسولِ خدا کا سہارا نہ ملتا
تو ہم بے سہاروں کا کیا حال ہوتا

ایسی بے شمار نعتیں ہیں جو محمد رفیع نے فلموں کے لیے ریکارڈ کروائی ہیں۔

شاہِ مدینہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
تم پہ نچھاور تم پہ فدا ہم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ خوب صورت کلام لوگوں کے ذہنوں میں آج بھی تروتازہ ہے۔ محمد رفیع نے کوئی تین درجن کے قریب فلمی (مان گئے استاد، ماں کے آنسو، حاتم طائی، بغاوت، دین اور ایمان وغیرہ) اور غیر فلمی حمدیں اور نعتیں پڑھیں۔ اُن کی ایک نعت آج بھی پاکستانی نعت خوانوں میں مقبول ہے:

میری جھولی کو بھر دے اے خدا صدقے محمدؐ کے

اُن کے علاوہ گلوکارہ شمشاد بیگم (جن کا بنیادی تعلق لاہور سے تھا مگر قیامِ پاکستان کے بعد بھارت ہی میں مقیم رہیں) نے بھی کئی بہت خوبصورت نعتیں ریکارڈ کروائیں۔ دو نعتیں فلم ''ماں کے آنسو'' کے لیے ریکارڈ کروائیں۔ جب کہ اِن میں سے پہلی نعت تو آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ ہندوستان، پاکستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے بار بار نشر ہوتی رہی ہے جس کے بول ہیں۔

پیغامِ صبا لائی ہے گلزارِ نبیؐ سے

آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبیؐ سے
میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلِّ علیٰ کہتے کہتے

آخرالذکر نعت کو نیرہ نور، خورشید احمد، اویس رضا قادری کے علاوہ بھی کئی ایک پاکستانی نعت خوانوں نے بھی پڑھا۔

شمشاد بیگم اور محمد رفیع کے علاوہ لتا منگیشکر کی آواز میں بھی نعتیہ کلام بھارتی فلموں میں شامل کیا گیا۔ اُنہوں نے فلم اللہ رکھا، صنم بے وفا اور نیاز اور نماز وغیرہ کے لیے نعوت ریکارڈ کروائیں۔۔لتا کی آواز میں ایک نعت کسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے بہت نشر ہوتی تھی

دل کی کشتی بھنور میں آئی ہے
کملی والے تیری دہائی ہے

فلم مغلِ اعظم کے لیے شکیل بدایونی کی نعت سحر انگیز ثابت ہوئی۔اسے بھی سچو ایشن کے مطابق لکھا اور بڑے سوز سے لتا نے ترنم سے گایا تھا:

بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ
گردش میں ہے تقدیر بھنور میں ہے سفینہ

خاک ہو جائیں مدینہ کی شرف مل جائے
ہم بھی کہلائیں مدینہ کے مقامی آقاؐ
(اکرم کنجاہی)

سادہ گیت اور پیچیدہ نعت کا شاعر (آرزو لکھنوی)

برصغیر میں جب فلم کا آغاز ہوا تو کافی عرصہ تک فلمی گیت نگاری کو معیاری شاعری خیال نہیں کیا جاتا تھا۔اسی طرح فلم کے لیے کہانی تحریر کرنے والوں کو ادیب نہیں منشی کہا جاتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ صفِ اوّل کے شاعر اور ادیب فلم نگری کا رخ نہیں کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلی آنی شروع ہوئی ایک طرف آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹ء۔۱۹۳۵ء) نے اسٹیج ڈرامہ نگاری اور دوسری طرف آرزو لکھنوی (۱۸۷۲ء۔۱۹۵۱ء) نے فلمی گیت نگاری میں انقلاب برپا کر دیا۔ وہ پہلے اچھے شاعر تھے جنہوں نے باقاعدگی سے فلموں کے لیے گیت لکھے ۔انہوں نے ۱۲ سال کی عمر میں جلال لکھنوی کے شاگردی اختیار کی۔ اُن سے شاعرانہ رموز کے علاوہ عربی و فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ وہ ڈرامہ نگار بھی تھے۔اُن کے ڈرامے چراغِ توحید،حسن کی چنگاری اور چاند گرہن مشہور ہوئے۔علم نجوم اور موسیقی سے خاصا لگاؤ تھا۔اُن کا ایک مجموعۂ کلام ''سریلے بانسری'' اِس حوالے سے منفرد ہے کہ اس میں عربی و فارسی کا کوئی لفظ نہیں گویا وہ عربی و فارسی سے پاک ہے۔لہذا اُن کے کلام سے متعلق یہ درست کہا جاتا ہے کہ اُس میں میر و مومن کی سادگی اور شیرینی ہے۔''جانِ آرزو'' اور ''فغانِ آرزو'' بھی اُن کے مجموعہ ہائے کلام ہیں۔

کلکتہ میں جب فلم کمپنیوں کے کام کو عروج حاصل ہوا تو آرزو کو حصولِ رزق کے لیے لکھنو سے آنا پڑا۔ جہاں وہ مشہور فلم کمپنی نیو تھیٹر سے منسلک ہوئے۔سب سے پہلے مشہور فلم دیو داس کے گیت لکھے جو مقبول ہوئے۔اُنہوں نے لاتعداد فلموں کے لیے گیت نگاری کی۔اُن کے ابتدائی گیت زیادہ تر سہگل،کانن بالا،پنکج ملک وغیرہ نے گائے۔

۱۹۴۲ء میں وہ بمبئی آ گئے کیوں کہ سہگل بھی بمبئی آ چکے تھے۔''ڈان'' کے مشاعرے کے سلسلے میں ۱۹۵۰ء میں کراچی آئے اور احباب کے اصرار پر یہیں رہ گئے۔ریڈیو پاکستان پر اصلاحِ تلفظ کے لیے بہزاد لکھنوی کے علاوہ آرزو لکھنوی سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا۔ بہت عمر

رسیدہ ہو چکے تھے۔ بیماری کی حالت میں ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا اور لیاقت آباد کے ایک قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

آرزو لکھنوی کے حوالے سے مجھے ایک بات پر تعجب ہے۔ وہ فلمی دنیا کے پہلے قابلِ ذکر گیت نگار ہیں۔ نغمہ نگاری میں سادگی، روانی، شیرینی، غنایت اور شعریت لوازم قرار دیئے جاتے ہیں۔ گیت نگاری میں اگر فکر کی پیچیدگی ہے یا پھر ادائیگیٔ جذبات کے لیے الفاظ کا چناؤ درست نہیں تو گیت تاثیر سے خالی اور بے کیف ہو جاتا ہے۔

بے شک آرزو لکھنوی عربی اور فارسی پر بھی بڑی دسترس رکھتے تھے مگر اُن کا مجموعہ کلام ''سریلی بانسری'' اِس بات کا ثبوت ہے کہ اُنہوں غزلیات میں عربی فارسی کا بھی استعمال نہیں کیا لیکن اُن کے جو نعوت میری نظر سے گزری ہیں، اُن میں بہت حد تک اسلوبِ بیاں کے ساتھ ساتھ فکر کی بھی پیچیدگی نظر آئی ہے۔ کئی اشعار اگر پوری نعت کے پس منظر میں نہ پرکھے جائیں تو شاید پہچان بھی مشکل ہو جائے کہ یہ نعتیہ اشعار ہیں۔ سید محمد قاسم نے اپنے تذکرے ''پاکستان کے نعت گو شعرا'' میں اُن کی جس نعت کو انتخاب کے طور پر شامل کیا ہے، اُس کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ایک عام سطح کا قاری اِس سے کیا اخذ کرے گا۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے روایتی فکر و اسلوب سے انحراف کیا ہے:

وہی اک شکل کہ اِس آئینہ خانے میں نہیں
خود نما کون ہے پھر حسن اگر ہے خود بیں
چلتی پھرتی ہوئی پرچھائیاں سی چاروں طرف
پر کہیں پیشِ نظر پھر نہ مکاں ہے نہ مکیں

اُن کی ایک اور نعت کا حوالہ بھی لازمی دوں گا جو ''ارمغانِ نعت'' میں محقق شفیق بریلوی نے دی ہے ۔ دس اشعار کی اِس نعت کے اولیٰ مصارع میں بھی شاعر پر جس فکر و خیال کا انکشاف ہوا ہے، اُس کی ترسیل اور تفہیم ادب کے عام قاری کے لیے پہیلی بنا دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

حمایت علی شاعر نے اپنی نعتیہ تحقیق ''عقیدت کا سفر'' میں اِس نعت کے چھ اشعار ہی شامل کیے ہیں۔ ہاں البتہ ثانی مصارع کی ردیف'' محمدؐ کا'' سے پتا ضرور چلتا ہے کہ یہ نعتیہ اشعار ہیں۔مذکورہ نعت میں سے فکری و اسلوبیاتی اعتبار سے عام فہم اور شعریت کے حامل دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

ڈرے کیا آتشِ دوزخ سے دیوانہ محمدؐ کا
کہ اٹھتے شعلے گل کرتا ہے پروانہ محمدؐ کا
یہاں سے تا بہ جنت روک ہے کوئی نہ پرسش ہے
جہاں چاہے چلا جا بن کے دیوانہ محمدؐ کا

اصحابِ پاکؓ جب بھی تصور میں آئے ہیں
اُترے ہیں ذہن پر مہ واختر تمام رات
(اکرم کنجاہی)

کرم گستری کا متمنّی آرزو اکبرآبادی

آگرہ کی سرزمیں بڑی مردم خیز ہے میر، غالب، نظیر، سیماب کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ وہیں ۱۹۳۰ء میں آرزو اکبرآبادی نے جنم لیا۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر اچھی صحبت سے تعلیم کی کمی پوری کی۔ پیشے کے اعتبار سے خیاط تھے۔ تمام عمر مالی پریشانیوں میں بسر ہوئی۔ کبھی معاشی آسودگی نصیب نہ ہوسکی۔ سب سے پہلے اُن کا ایک لوک گیت:

''سر دتہ کہاں بھول آئے پیارے نندوئیا''

یہ گیت کبھی ریڈیو پر دن میں کئی بار نشر ہوتا تھا۔ آپ کی ایک فلمی غزل:

''جب تصور میں کبھی آپ کو پاتا ہے دل''

جس کی موسیقی تصدق حسین نے ترتیب دی اور مالا نے گایا ایک فلم شب بخیر میں شامل ہوئی۔ اُن کی ایک قوالی فلم ''چاند سورج'' کا حصہ بنی

''محبت کرنے والو ہم محبت اِس کو کہتے ہیں''

اسے نامور قوال غلام فرید صابری نے گایا تھا۔ آرزو لاہور بھی گئے مگر جلد کراچی واپس آ گئے وہاں اُنہوں نے ایک فلم ''کردار'' کے لیے گیت لکھے لیکن فلم فلاپ ہونے کی وجہ گیت بھی مقبول نہ ہوسکے۔ اُنہوں نے زیادہ تر گیت کراچی میں بننے والی فلموں ہی کے لیے لکھے۔ اُن کا مجموعۂ کلام ''کیفِ بہاراں'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اسی سال اُن کا کراچی میں انتقال ہوا۔

سورہ احزاب میں اللہ نے کہہ دیا کہ ''اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے آپ ﷺ پر سلام بھیجتے ہیں۔ اس لئے اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجو'' چنانچہ نعت کے آغاز پر حضور ﷺ کی خدمت میں صلوٰۃ وسلام پیش کرنا بھی نعت کا اہم حصہ ہے اور شعراء نے ساری نعت بھی صلوٰۃ وسلام کے بیان پر کہی ہے۔ حضور پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا اور درود بھیجنا اللہ کا حکم ہے۔

نعت کی کئی اقسام ہیں مثلاً رسمی نعت (کسی دوسری صنف ادب سے پہلے حمد یہ و نعتیہ

اشعار)، حقیقی نعت (الگ صنفِ ادب کے طور پر، حصولِ ثواب کے لیے)، عشقیہ نعت، توصیفی نعت، تاریخی نعت، مقصدی نعت، سراپا نگاری۔ حضور پر صلوۃ وسلام پڑھنا اور درود بھیجنا بھی نعت کی ایک مقبول قسم ہے۔

آرزو اکبرآبادی کی ایک نعت ملاحظہ کیجیے جس کا آغاز شاہِ بطحا پر سلام کے شعر سے ہو رہا ہے۔ اِس مطلع میں اُنہوں نے واقعہ معراج کا ذکر بھی کیا ہے۔ دیگر اشعار میں وہ آپؐ کی صفات کے جلوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ شرق وغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بس آپؐ ہی کی ذات کا اعجاز ہے۔ نعت کے آخری تین چار اشعار میں اپنی کم مائیگی کا اظہار کرتے ہیں کہ میرا علم بہت محدود ہے۔ رہوارِ فکر سے لغزشتیں ہوسکتی ہیں۔ وہ نشیب وفراز سے واقف نہیں ہے۔ اگر مجھ سے کوئی بھول ہو جائے تو درگزر فرمائیے گا۔ بس آپؐ کے حکم کا منتظر ہوں کہ ایک اور مطلع آپؐ کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ نعت اپنے اسلوبِ بیاں کے اعتبار سے ایک مختلف رنگ میں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سلام اے شاہِ بطحا، سلام اے شاہِ حجاز
ترے نقوش قدم سے ہے عرش سر افراز
مری نگاہ نے دیکھے ہیں ایسے عالم بھی
جہاں صفات کے جلوے ہیں ذات کا اعجاز
جہاں حدود نہیں شرق و غرب کی قائم
جہاں پر جلوے ہی جلوے ہیں خانہ بر انداز
ترا جمال بصد ناز یوں نمایاں ہے
کہ جیسے سایۂ قران میں حمائلِ راز
بہک چلی ہیں نگاہیں بھٹک چلے ہیں قدم
بدلنے والی ہے رہوارِ فکر کی پرواز

کرم ہو سیّدِ کون و مکاں ، قلم سے مرے
اگر ہوں لغزشیں کر دیجیے نظر انداز
کہ علم ہے تو بہ مقدارِ خالِ عارضِ شب
جو فکر ہے تو ہے بیگانۂ نشیب و فراز
عطا ہو حکم کہ اک اور بھی پڑھوں مطلع
کہ ہو چلی ہے یہاں طبع آرزو غمّاز

حسنِ اعمال کی رعنائی سے خالی میں بھی
میرے آقاؐ تری رحمت کا سوالی میں بھی
زرد موسم مری شادابی کے دشمن سارے
شاہِ کونینؐ کرم ، خستہ سی ڈالی میں بھی
(اکرم کنجاہی)

دیارِ رسول ﷺ کا زائر (بہزاد لکھنوی)

(۱۹۰۰ء لکھنو ۔ ۱۹۷۴ء کراچی)

بہزاد لکھنوی کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد سجاد حسین خان مرحوم راز رام پوری بھی مستند شاعر تھے۔ بہزاد فاخر لکھنوی (داغ دہلوی کے شاگرد) سے اصلاح لیتے تھے۔

انٹر کرنے کے بعد ریلویز میں بطور ٹکٹ چیکر ملازم ہو گئے۔ ایک دن ریل کے سفر میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے شعر و شاعری سے لے کر تصوف کے اسرار و رموز تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ بزرگ جب اپنی منزل پر اترنے لگے تو انہیں گلے لگا کے زور سے

بھینچا۔اس واقعہ کے بعد اُن پر دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ایک عجیب ازخودرفتگی کا عالم تھا۔زبان پر ہروقت اشعار کاورداورخود سے بےخبر۔نوکری گئی،گھر چھٹا،بال بچوں سے جدا ہوئے۔

مختلف شہروں،قصبوں اور جنگلوں کی خاک چھانی،دل کوکسی پل قرار نہ تھا۔ایک ہم درد انہیں بریلی کے بڑے روحانی دربار کے سجادہ نشین حضرت سراج السالکینؒ کے پاس لے گیا، اُنہوں نے اِن پرنظر ڈالی،اضطرابی کیفیت ختم ہوئی،ہوش وحواس میں آئے۔حضرت کے ہاتھ پر بیعت۔اُنہوں نے ان کے گلے میں گریبان گیریاں ڈال دیں تاکہ گریبان چاک نہ کریں۔ مرشد کے کہنے پر ۱۹۴۰ء میں بمبئی آ گئے۔یہاں اُنہوں نے ۱۰ سال کے عرصے میں ۴۵ فلموں کے گیت لکھے۔جن میں زمیندار،خاندان،گجرے،لاڈلی،آگ،انوکھا پیار جیسی اہم فلمیں بھی شامل تھیں۔

اُنہوں نے لاہور میں بننے والی کچھ فلمیں بھی گیت لکھے۔آپ کے ابتدائی گیت زیادہ تر مکیش،شمشاد بیگم،لتا وغیرہ نے گائے۔اُن کا حلیہ فلمی گیت نگار ہونے کی نفی کیا کرتا تھا۔آپ کو خدا نے خوب صورت ترنم بھی عطا کیا تھا۔اُن کی ایک غزل

''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے''

جب وہ ترنم سے پڑھتے تو مشاعرہ لوٹ لیتے۔یہ وہی غزل ہے جسے گا کر نیرہ نور کو بھی مقبولیت ملی۔بلاشبہ اُنہوں نے فلمی گیت نگاری کو عروج بخشا اور اس شعبے میں بھی اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔۱۹۵۰ء میں پاکستان آ کر ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور ۱۲ سال تک ریڈیو کے لیے خدمات سرانجام دیں۔پاکستان آنے کے بعد آپ نے غزل کہنا ترک کر دی اور نعت نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔اُن کا پہلا مجموعۂ کلام ''کیف وسرور'' ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔۱۹۵۰ء تک اُن کے ۳۲ مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے۔اُن کے گیتوں کے مجموعے ''نغماتِ بہزاد'' اور ''بستانِ بہزاد'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔

اُن کی چند مشہور کتب میں نغمۂ نور،موجِ نور،موجِ طور،چراغِ طور،کیف وسرور،وجدو

حال، کفر و ایمان، مصحفِ بہزاد، نقشِ بہزاد، شامل ہیں۔اُن کا آخری نعتیہ مجموعۂ کلام ''کرم بالائے کرم'' تھا۔جس میں ۱۴۲ نعوت شامل تھیں۔آپ جب عشقِ مجازی سے عشق رسولﷺ تک پہنچے تو نعت نگاری ہی کو زندگی کا مقصد بنالیا۔عشق رسولﷺ میں سرشار ہوکر دن رات تڑپتے رہتے۔ہروقت ایک اضطرابی کیفیت طاری رہتے۔

حضور پُر نورﷺ کا ذکر آتا تو اشکوں کی جھڑی لگ جاتی۔آپ کے حج کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ایک دن ایک سندھی وڈیرا آپ کو تلاش کرتا ہوا ریڈیو پاکستان پہنچا اور بتایا کہ مجھے خواب میں آقائے دوعالم کا دیدار نصیب ہوا ہے۔آپﷺ نے فرمایا ہے کہ بہزاد میرے عشق میں تڑپ رہا ہے اُسے میرے پاس بھیجو۔

مدینے کو جائیں یہ جی چاہتا ہے
ہم مدینے سے اللہ کیوں آ گئے،
قلبِ حیراں کی تسکیں وہیں رہ گئی

آخری عمر میں تپ دق کی وجہ سے اوجھا سینیٹوریم میں داخل بھی رہے مگر ۱۹۷۴ء میں داغِ مفارقت دے گئے اور سخی حسن قبرستان کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

بہزاد عمومی طور پر سادگی کے ساتھ بے تکلف نعت کہتے ہیں۔ویسے تو اُنہوں نے بھی حضورؐ کی نعت کے تمام ہی موضوعات پر نعتیں کہی ہیں مگر اُن کے کلام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے چوں کہ خاکِ مدینہ کو آنکھوں کا سرمہ بنایا ہوا ہے، اِس لیے اُن کی نعت نگاری کا بنیادی، مرکزی اور اہم ترین موضوع ''یادِ مدینہ'' ہے۔

عبدالغفور قمر نے اپنے ''انتخاب ِ نعت'' میں بہزاد کی جو ۱۳ نعوت شامل کی ہیں، اُن پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ تمام ہی مدینہ، گنبدِ خضریٰ، درِ خیرالوری، مسجدِ نبوی، صحنِ مسجد، اذنِ حضوری، کیفِ حضوری اور روضے کی جالیوں سے متعلق ہیں۔کوئی ایسا نعت گو نہیں ہے جس نے دیارِ نبیﷺ سے متعلق متعدد نعتیں یا اشعار نہ کہے ہوں مگر

بہزاد نے جس تخلیق وفور کے ساتھ شہرِ رسول ﷺ اور اُس کے متعلقات پر نعتیں کہی ہیں اُس کے مثال نہیں ملتی۔ مذکورہ انتخابِ نعت میں اُن کی ایک ایسی نعت شامل کی گئی ہے جس میں وہ مدینہ منورہ کے زائر سے مخاطب ہوکر سفرِ مکہ و مدینہ اور حاضری کے آداب بتا رہے ہیں۔ اُسے کہتے ہیں کہ یہ احساس دل میں جاگزیں رکھنا کہ سوئے بطحا سفر بالکل مختلف ہوتا ہے، یہاں ہر گام شکر کا سجدہ ادا کرتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔ اِس سفر میں جانے سے پہلے دنیا کے رنج و غم سے دامن خالی کر کے، تکالیف اور مصائب کو ٹھکرا کر جانا چاہیے۔ وہ عشق کا کعبہ ہے جہاں جسم نہیں دل و جان و روح طواف کرتے ہیں۔

اِس سفر میں خود عشقِ احمدِ مرسل رہنما ہوتا ہے اور شوقِ دل رہبری کرتا ہے۔ کیوں کہ نیازِ زندگی مضطرب ہوتا ہے تو جبینِ شوق گنبدِ خضریٰ کی جانب رخ کرتی ہے۔ اِس لیے راہ کے ہر پیچ و خم اور نشیب فراز سے بے پرواہ ہو کر جانا۔ اِس نعت میں حمدیہ اشعار بھی شامل ہیں۔ دو نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

مضطرب ہے ایک مدت سے نیازِ زندگی
چل جبینِ شوق سوئے گنبدِ خضریٰ چلیں
عشقِ احمدؐ رہنما ہے راہبر ہے شوقِ دل
راہ کے ہر پیچ و خم سے ہو کے بے پروا چلیں

نعتیہ مضمون کے اعتبار سے اُن کی نعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ایسی نعوت جن میں اذنِ حضوری کی التجا اور حاضری کی خواہش اور تڑپ ہے۔ جو دل اُن کو تڑپا رہا ہے وہ دلِ بے قرار لے کے جانا چاہتے ہیں

۲۔ ایسی نعوت جن میں عین حاضری کے وقت کی قلبی محسوسات بیان کی گئی ہیں۔

۳۔ ایسی نعوت جن میں واپسی کے بعد کی مدینہ، گنبدِ خضریٰ، روضے کی جالیوں کا ذکر بڑے عالمِ شوق میں کیا گیا ہے۔ واپس آنے کا دکھ واضح ہے۔

آیئے اُن کے کلام پر اِن تینوں پہلوؤں کے حوالے سے بات کرتے ہیں یعنی حسرت وآرزو، حاضری وحضوری اور حاضری کے بعد کی قلبی کیفیات:

ا۔ بہزاد کے حوالے سے ایک سندھی وڈیرے کا واقعہ تو کتابوں میں درج ہے کہ وہ انہیں تلاش کرتا ہوا ریڈیو پاکستان کراچی پہنچا اور کہا کہ مجھے خواب میں حضور ﷺ نے حکم دیا ہے کہ بہزاد میرے لیے تڑپ رہا ہے اُسے میرے پاس بھیجو۔ بہزاد وہاں دل و جان اور روح کو لے کر جانا چاہتے وہ ہر ایک کذب کو یہاں چھوڑ کر، وہاں کے تقدس کا خیال کرتے ہوئے زندگی کی صرف سچائیاں لے کر جانا چاہتے ہیں، وہ فکرِ سخن اور زبان لے کر جانا چاہتے ہیں جو ہر وقت اُن کی ثنا میں مگن رہتی ہے۔

محمد محمدؐ پکارتے ہوئے ایمان کی کلکاریاں لے کر جانا چاہتے ہیں۔ یہ حسرت لے کر جانا چاہتے ہیں کہ کبھی دیارِ حبیب نہ چھوٹے، دل کا درد جو ہر وقت انہیں تڑپاتا رہتا ہے اُسے بھی لے کر جانا چاہتے ہیں۔ آخر پر کہتے ہیں کہ ہائے میرے پاس تو حضور ﷺ کے شایانِ شان کچھ بھی تو نہیں، میں شاہِ شہاں کو کیا پیش کروں؟؟؟ اور وہاں پہنچ کر آپ کی سنت اور سیرت کی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جس نعت کی معنویت بیان کی ہے، وہ ایک ہی موضوع پر اور ایک ہی فضا میں ہے۔ اُس نعت کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدینے دل و روح و جاں لے کے جاؤں
محبت کا سارا جہاں لے کے جاؤں
محمدؐ محمدؐ ہو ہونٹوں پہ میرے
میں ایماں کی گلکاریاں لے کے جاؤں

کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ کیجیے جن میں وہ درِ خیر الوریٰ اور دیارِ مصطفےٰؐ کی آرزو کر رہے ہیں۔ اللہ کریم سے ملتمس ہیں کہ میری آنکھوں کو رحمتِ عالم کا روضہ دکھا دے۔ اس لیے کہ میرا دل ہر وقت مجھے کہتا ہے، دل تھام کر، بادیدۂ نم، زمانے کے غم دور کرنے کے لیے مدینے چلو۔ وہاں

سب ٹھیک ہو جائے گا۔اُن کی خواہش ہے کہ محبت کا سارا جہاں لے کر مدینے پہنچ جائیں۔ وہاں پہنچ جائیں جہاں کونین کی تمنائیں مچل مچل جاتی ہیں۔ دو عالم کے آقا و مولا کے پاس جا کر بس ایک کام کریں کہ اللہ کے حبیب کی سیرت اور احادیث کی باتیں کریں۔ کہتے ہیں کہ ہر دن مدینے کی حسرت اور ہر پل سبز گنبد کا خیال رہتا ہے، کیا یہ رحمت نہیں ہے؟ کیا یہی عبادت نہیں ہے؟ وہ اوروں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر زخمِ دل کا مرہم چاہتے ہو تو خاکِ مدینہ میں تلاش کرو۔ کہیں اور جاؤ گے تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ ایک ہی دارالشفا ہے، دیدۂ شوق کا مرکز جسے مدینہ کہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدینے کی حسرت پہ قربان جاؤں
یہ رحمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
کہ اُس سبز گنبد کا ہر دم تصور
عبادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

مدینے کے آقاؐ دو عالم کے مولا
ترے پاس آئیں یہ جی چاہتا ہے
جو تڑپا رہا ہے مری زندگی کو
وہی دل کا دردِ نہاں لے کے جاؤں

ہر قدم چاہیے سجدۂ آرزو
سر کو کرتے ہوئے خم، مدینہ چلو

درِ خیر الوریٰ ؐ کی آرزو ہے
دیارِ مصطفیٰؐ کی آرزو ہے
دکھا دے رحمتِ عالم کا روضہ
یہی ہر نینوا کی آرزو ہے

۲۔نصر من اللہ و فتح قریب پڑھ کر بہزاد لکھنوی سوئے حبیب عازمِ سفر ہوئے تو بے بسی اور ناتوانی یہاں رہ گئی اور اللہ اور اُس کے حبیب کی رحمتیں ہم سفر ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر اپنی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ درِ خیر الوریٰ، درِ حاجت روا پر کھڑا ہوں جہاں ہر غم کی دوا زود اثر ہے۔میری دعائیں مستجاب ہوئی ہیں۔ مجھے دعاؤں کا صلہ مل گیا ہے۔

میری قسمت تو دیکھیے اُس پاکیزہ جگہ پر ہوں کہ نبی پاکؐ کی محراب ہے، وہ مقام ہے جہاں حضورؐ کے نقشِ پا ہیں۔آپؐ کا دستِ سخا ہے جس سے دامن بھرے جا رہا ہوں لیکن دل بھی اتنی عظیم ہستی کے دربار میں بڑا مرعوب ہوا جا رہا ہے۔

جب سے بابِ رحمت سے داخل ہوا ہوں آپؐ کی عطاؤں کا شمار نہیں۔لہذا دعا کرتے ہیں کہ اللہ کریم بہزاد کو ہر سال یہاں لے کر آئے۔ایک اور نعت میں وہاں پہنچنے کے بعد کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عمر تاریکیوں میں بیتی تھی اب روشنی میں آئے ہیں۔ یہ دیارِ نبیؐ منزلِ حق تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ہمیں اب اِس دنیا کی فکر سے کیا واسطہ کہ ہم دنیا کی جنت میں آ گئے ہیں۔ہم ایک پناہ گاہ میں ہیں ہمیں اب ہرگز کوئی ڈر نہیں۔مسجدِ نبوی کے صحن کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہاں ہر سر خم نظر آیا۔

اللہ اللہ وہاں ہر طرف رنگ و نور ہی کے ڈیرے ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ مدینے کے دن ہی نہیں راتیں بھی درخشاں درخشاں اور منور منور ہیں۔ یہ بستی معطر معطر ہے میں اسے جنت نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ ہر دم آقاؐ کے روزے پر نظریں جمائے ہوئے ہوں اور اِس کیفیت میں کوئی سوزِ الم ہے نہ دردِ جگر کا سامنا ہے۔ میں سرور و کیف کی کیفیت میں از خود رفتہ ہوں۔ میں وہاں سجدہ ریز ہوں جہاں فرشتے بھی آ کر سر جھکاتے ہیں۔ایسی چند نعوت سے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ترے سبز گنبد پہ ہر دم نظر ہے،
نہ سوزِ الم ہے نہ دردِ جگر ہے

نہ اپنی خبر ہے نہ دل کی خبر ہے،
یہ راحت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
درِ خیر الوریٰؐ ہے اور میں ہوں
مرے غم کی دوا ہے اور میں ہوں
خوشا قسمت کہ محرابِ نبیؐ میں
کسی کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں
ہم دیارِ نبیؐ میں آ پہنچے
منزلِ حق رسی میں آ پہنچے
ہم کو فکر جہاں سے اب کیا کام
جنتِ زندگی میں آ پہنچے

۳۔حاضری وحضوری کے بعد شام وسحر مدینے ہی کا پاکیزہ ذکر کرتے رہتے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ دل و جان وہیں چھوڑ آئے ہیں۔وہاں کی جانفزا کیفیات کا عقیدت واحترام سے ذکر کرتے ہیں کہ مدینہ شریف میں قیام کے دوران اللہ اللہ درود وسلام اور قیام وسجود کا کیسا پیارااور کیف پرور منظر تھا۔وہاں کی صلوۃ میں بھی کتنا دلی سکون تھا۔ہر قدم سجدہ ریزی میں لذّت ہی لذّت تھی۔یہ کیفیت بھی اُن کی کئی نعتوں میں ہے کہ دیارِ رسولِ اکرم ﷺ سے واپسی پر سبز گنبد، بابِ رحمت اور روضے کی جالیوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔وہاں کی کرم بخشیوں، رحمت، سرور و لطف کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔یہاں تک کہ اپنا دین وایماں بھی اُس شہر میں قرار دیتے ہیں۔

میں تنہا ہوں یہاں مگر ہم نشیں
مرا دل مری جاں ہے اُس شہر میں
حضوری میں جو تھااک کیف طاری
وہ عالم اور نقشہ ہے نظر میں

کاش اُس کیفیت کو دوام اور ہمیشگی مل جائے۔ پھر کہتے ہیں کاش ہم لوٹ کر نہ آتے اور ہماری زندگانی وہیں پر بسر ہو جاتی۔ ہر تمنّا پوری ہو گئی بس یہی اک تمنّا رہ گئی۔ اُن کی ایک نعت جو اوّل و آخر اسی کیفیت کی عکاس ہے، اُسے کئی نعت خوانوں نے بڑے سوز اور گداز سے پڑھا ہے۔ غزلیہ ہئیت کی مذکورہ نعت کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم مدینے سے اللہ کیوں آ گئے
قلبِ حیراں کی تسکیں وہیں رہ گئی
دل وہیں رہ گیا جاں وہیں رہ گئی،
خم اُسی در پہ اپنی جبیں رہ گئی
یاد آتے ہیں ہم کو وہ شام و سحر،
وہ سکونِ دل و جاں، وہ روح و نظر
یہ انہیں کا کرم ہے انہیں کی عطا،
ایک کیفیتِ دل نشیں رہ گئی

اسی موضوع پر چند اور اشعار ملاحظہ کیجیے وہ طیبہ کو مرکزِ اصفیا اور منزل عرفاں قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جبیں تو کیا میں دل بھی جھکا دوں اگر مجھے مدینہ میں نماز میسر آ جائے۔ اُن کی نظر میں طیبہ کی حسرت میں جو آنسو گرا وہ انمول ہو گیا اور اگر وہ اشک عقیدت سے روضے کی جالیوں کے سامنے بہایا گیا، وہ خورشید کی طرح رخشاں ہو گیا۔

حسرتِ طیبہ میں جو بھی گر پڑا
اپنے اُس آنسو کی قیمت کیا کہوں
جالی کے سامنے جو بہائے تھے آنکھ نے
رخشندہ مثلِ مہر وہی اشکِ تر ملے

وہ مدینہ شریف کی حاضری کے بعد واپس آ کر بھی تصور میں وہاں کے نظاروں میں مگن

رہتے ہیں ایک شعر جس میں وہ کہتے ہیں:

اک رات مجھے لے گیا اُس جا پہ تصور

ہے کام جہاں لفظ و بیاں کا، نہ صدا کا

سبحان اللہ کیسا لاجواب شعر ہے۔اسی طرح ایک اور شعر میں جذبِ شوق کی خیالی کیفیت اِن الفاظ میں بیان کر رہے ہیں:

خوشا جذبِ الفت، خوشا دردِ پیہم

خیالوں میں شام و سحر ہے مدینہ

یادِ مدینہ کے بعد اُن کے ہاں حضورﷺ کی عظمت کے حوالے سے سفرِ معراج اہم موضوع ہے۔ایک نعت میں حضورؐ کے سفرِ معراج کو بیان کرتے ہوئے آپؐ کی جن صفات کا ذکر بہترین تلفیظ سے کیا ہے۔اُن میں:

شاہِ دو عالم، نوح کے مونس، خضر کے ہم دم، ختم رُسل، فخرِ جہاں، حاسلِ کُل، وجہِ زماں، کونین کی عزت، نازشِ عالم، سب کے مکرم، سب کے معظم، نورِ ہدایت، رہبرِ اعظم، ہر رمز کے واقف، ہر راز کے محرم۔اِن لفظیات کے ذریعے دراصل شاعر نے معنی کی بہترین تخم ریزی کی ہے۔اِس نعت کی لفظ بندی میں تبدیلی نظر آ رہی ہیں۔یہ کوئی استعاراتی یا اشاراتی الفاظ نہیں ہیں کہ معنی کشائی کی ضرورت پیش آئے بلکہ یہ حضور اکرمﷺ کی گوناگوں شخصی صفات کا سادہ اظہار ہیں مگر حسن و جمال میں اضافہ کا سبب ہیں کہ اِن کی نشست و برخاست دل کش آہنگ پیدا کر رہی ہے۔یوں کہنا چاہیے کہ حضورؐ کے معراج پر تشریف لے جانے کے بعد وہاں موجودات کے جذبات کا شاعرانہ اظہار ہے۔اکھڑ یا بھدے الفاظ تو ویسے بھی نعوت میں استعمال نہیں ہوتے۔اِس میں شک نہیں کہ بہزاد کا ایک مخصوص لسانی مزاج تھا جو کلام میں ہر مقام پر غنائیت کا سبب بنتا تھا مگر ایک بہترین شاعر ہونے کے ناطے اُنہوں نے تصنع سے دامن بھی بچایا ہے اور اسلوب میں نیا پن اور تازہ کاری بھی پیدا کی ہے۔

معراج کی شب اک شور اٹھا
لو! شاہِ دو عالم آ پہنچے
لو! نوح کے مونس آ پہنچے
لو! خضر کے ہم دم آ پہنچے
جو ختمِ رسل ہیں، فخرِ جہاں
جو حاصلِ کل ہیں، وجہ زماں
کونین کی عزت ہے جن سے
وہ نازشِ عالم آ پہنچے

اُنہوں نے اپنے درود وسلام کے نذرانے میں بھی حبیبِ کبریا کی صفات خوب صورت الفاظ کے ساتھ واضح کی ہیں مثلاً مبتدا، منتہا، حق نظر، حق نگاہ، حق آگاہ، حق ادا م حق نما، مظہرِ اولیں، ختمِ رسل، خاتم الانبیاً، جہاں تاب، جہاں پرور، جہاں آشنا، فخرِ نوع وکلیم، نازشِ انبیا۔

یہ الفاظ کا حقیقت پسندانہ استعمال ہے جنہوں نے صوتی روانی میں رکاوٹ پیدا کرنے کی بجائے حسن و جمال پیدا کیا ہے۔ کہیں بھی شہ پارے کی بے ساختگی متاثر نہیں ہوئی۔ یہ کوئی جدید الفاظ نہیں ہیں۔ یہ کسی نہ کسی صورت میں نعتیہ ادب میں برتے جاتے رہے ہیں۔ سلام کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

مظہرِ اولیں و ختم رسل خاتم الانبیاً درود و سلام
فخرِ نوح و کلیم و آدم و خضر نازشِ انبیاً درود و سلام

شافعِ محشر کے طور پر نبی اکرم ﷺ کے وصف پر مسلمانوں کا ایقان ہے مگر اِس موضوع پر کئی اشعار حیرت زدہ بھی کر دیتے ہیں کیوں کہ میزانِ عدل، اعمال نامے، جزا و سزا کے تصورات بھی اپنی جگہ پر ہمارے ایمان کا حصہ ہیں۔ حافظ لدھیانوی ہمارے بڑے نعت نگاروں میں سے ایک ہیں۔ اُن ہی کا ایک شعر دیکھ لیجیے۔ پڑھے لکھے قارئین رائے خود قائم کریں۔ ایک تو زیارت

یقیناً خواب میں ہوئی ہوگی ۔ بہت بڑی سعادت ہے۔ پھر کیا سارے اعمال نامے یک سر ایک طرف رکھ دیئے جائیں گے؟

صد شکر کہ حافظ ہے زیارت سے مشرف
اب حشر کے دن اِس کو شفاعت کا یقیں ہے

جناب راسخ عرفانی مرحوم بھی ہمارے اہم نعت گو شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک قدم اور آگے نکل گئے ۔ کیا شفاعت کی امید میں انسان کو غلط راستوں کا انتخاب کر لینا چاہیے شفیعِ روز جزا ہیں مرے رسولِ کریم ﷺ یہی یقیں مرے عصیاں کے ارتکاب میں ہے بہزاد کے ہاں حیران کُن طور پر شفاعت کے موضوع پر کم اشعار ملتے ہیں جن میں فکری اعتدال وتوازن ہے۔

تمہی ہو امیدِ دلِ عاصیاں شفیعِ زماں ہے تمہاری ذات (بہزاد)

خلق میں ایسا نہیں، آپؐ کا خلقِ عظیم میں جس سے موازنہ کیا جا سکے۔ آپؐ کی صورت ہی جمیل نہیں آپؐ کی سیرت بھی بے مثال ہے۔ وہ فخر امم اور عظمتِ نوع بشر ہیں تو اُس کا ایک سبب یہ ہے کہ آپؐ نے عمل کے چراغ جلا کر زندگی کے دساتیر کی تکمیل کی۔ اب جہاں جہاں انسان کو گم رہی کا ڈر ہو سردارِ انبیاؑ کی سیرت اور سنت سے رہنمائی لے سکتا ہے۔ آپؐ کا خلقِ عظیم ہر بشر کے لیے بے نظیر ہے۔ وہ عرش سے اُترے صحائف کی مانند پاکیزہ اور مطہر ہیں۔ آپؐ کی عادات کیا تھیں گویا آیاتِ قرانی کی تجسیم تھی۔ اُنہوں نے اپنے کریمانہ اخلاق و کردار سے ایک عالم کو تسخیر کیا، جسمانی طور پر بیڑیاں پہنا کر نہیں، روحانی طور پر اُن کے اذہان وقلوب پر حکم رانی کر کے۔

آپ کا ہر ہر عمل ایک بہترین انسانی معاشرت کا حسن تھا۔ آپؐ کا فرمان اللہ کا فرمان تھا کہ آپ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتے تھے اور آپؐ کا عمل سماج کے لیے خیر ہی خیر تھا۔ آپؐ کی سیرت سے استفادے کے فیوض و برکات اتنے ہیں کہ وہ ہمارے دل کی دولت ہے۔ اگر انسان نے اپنے سماج اور معاشرے کو تنزل اور ہر طرح کی گراوٹ سے محفوظ رکھنا ہے تو یقین ہونا چاہیے

کہ آپؐ ہی کی سیرت آپؐ ہی کے کردار کا سکہ رائج کرنا پڑے گا۔

بہزادلکھنوی ہوں یا دیگر نعت نگار جب وہ مدینے پر نظر رکھنے کی بات کرتے ہیں تو دراصل مدینہ اُن کے کلام میں علامت ہوتا ہے، حضورؐ کی تعلیمات، آپؐ کے بتائے ہوئے رستے، آپؐ کے دیئے ہوئے دستورِ حیات، خود آپؐ کی سیرت اور کردار کی۔

یہی وجہ ہے کہ بہزاد نے بھی بار بار مدینے کا کلام میں ذکر کیا ہے۔ وہ بجا کہتے ہیں کہ جینا ہے تو اِس طرح جیو کہ نظر سوئے مدینہ ہو کہ صراطِ مستقیم اللہ کا حکم ہے اور صراطِ مستقیم کا نام اُسوۂ رسول ﷺ ہے۔ یہ آپ کے سوا کون کر سکتا تھا۔ یہ ظرف، یہ عظمت، یہ اخلاص اور دردِ دل کی انتہا کہ خود فقیری اختیار کی اور دوسرں کو تاجِ شاہانہ بخش دیا۔ لہٰذا آپؐ کا فرمایا ہوا ہر لفظ اور آپؐ کا دیا ہوا پیام، صداقت اور سچائی کا آخری معیار ہے۔ اِس لیے بہزاد کا مشورہ ہے کہ عشقِ مصطفےٰؐ کا سہارا لیا جائے۔ جب حبِ رسول ﷺ ہو گی تب ہی ہم اُنؐ کے بتایئے ہوئے راستے پر گامزن ہو سکیں گے۔

چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں اُسوۂ حسنہ، سنت، حدیث اور پھر عشقِ محمدِ عربیؐ کی بات کی گئی ہے:

جینے والو اِس طرح دنیا میں جینا چاہیے
جو بھی عالم ہو ، نظر سوئے مدینہ چاہیے
اُسوۂ سرکار ہی تو ہے صراطِ مستقیم
جس سے حق راضی رہے ایسا قرینہ چاہیے
جب سے یاد شاہِ دیں رہنے لگی
مجھ کو جینے کا قرینہ آ گیا
دیا تاج دوسروں کو، رکھا خود کو وقفِ عسرت
زہے عالمِ فقیری، زہے عالمِ شہانہ

گفتۂ حق، پیغامِ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم
اسمِ معظم، نامِ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم
عشقِ احمدؐ ہی وہ دولت ہے جو گھٹتی نہیں
عشقِ احمدؐ ہی سے بس معمور سینہ ہے
عشقِ احمدؐ، یادِ بطحا اور کیفِ زندگی
یہ خزینہ، یہ خزینہ، یہ خزینہ چاہیے
حبیبِ کبریا کا عشق بہزادحقیقت میں خدا کی آرزو ہے

آپ سراپا نور تھے۔آپ کا مدینہ ''مدینہ منور'' کہلاتا ہے کہ انوار وتجلیات کا معمورہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جب ظہورِ قدسی ہوا تو اُس کے بعد ہی رخِ حیات درخشندہ ہوا۔آپؐ کائنات کا نور ہیں۔جمالِ مصطفےٰ کونین کا نور ہے۔عالم کا ذرّہ ذرّہ برقِ جمالِ حضورؐ سے روشن ہے۔ہر شے میں آپؐ ہی کا نور جلوہ ریز ہے۔

آپ سے پہلے حقیقت ہے کہ دنیا ایک ظلمت زار سے زیادہ نہیں تھی۔آپ کی ذاتِ مکرم، دنیا میں نورِ مجسم بن کر تشریف لائی۔قندیلِ حرم ہو یا شمع شبستانِ حرا، سب آپؐ ہی کے نور کی تابانی سے ضوفشاں ہیں۔اب آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ بہزاد لکھنوی، آپؐ نورِ مجسم کو کن الفاظ میں تحسین کا ہدیہ پیش کر رہے ہیں۔

بے شک آپ تمام نور، مہر درخشاں اور ماہِ منور ہیں۔کیا خوب لکھا ہے بہزاد نے کہ وہ صبح تاباں جس کی نمود آپؐ کے رخِ روشن سے ہوئی مجھے اُس سحر کی تلاش ہے۔آپؐ کے روئے منور سے ہر صبح درخشاں ہے اور صبح درخشاں خنداں خنداں ہے۔آپ کے سیاہ گیسوؤں کے دم سے دوعالم کی شام، شام بنتی ہے۔

نورِ تمام و نورِ مکمل، نورِ مجسم، نور سراپا
مہرِ درخشاں، ماہِ منور، صلی اللہ علیہ وسلم

وہ جو جانِ کشف و کشود ہے، وہ جو روحِ وردِ درود ہے
وہ جو تیرے رخ کی نمود ہے، مجھے اُس سحر کی تلاش ہے
ہیں تمہاری ضیائیں ہی چاروں طرف
مہرِ تابندہ ہو تم، ماہِ تاباں ہو تم
روئے منور صبحِ درخشاں، صبحِ درخشاں خنداں خنداں
گیسوئے مشکیں شامِ دو عالم، صلی اللہ علیہ وسلم

یہ گھٹن روز ہی بڑھتی ہے مسلسل اب تو
کوئی جھونکا ہی مدینے سے ہواؤ لاؤ
(اکرم کُنجاہی)

ساغر صدیقی (بیدار حسیت کا نعت نگار)

ساغر صدیقی ۱۹۲۸ء میں انبالہ مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ والد کا کنگھی سازی کا کام تھا۔ وہ انہیں بھی یہ کام سکھانے چاہتے تھے مگر ساغر کو یہ کام پسند نہیں تھا۔ شاعری سے دل چسپی پیدا ہوئی تو حبیب حسن سے اصلاح لیتے رہے۔ استاد انبالہ سے امرتسر آ گئے تو یہ بھی سکونت ترک کر کے امرتسر چلے آئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد مسلمانوں کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تو ساغر ایک قافلے کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ یہاں اکیلے تھے۔ ابتدا میں ناصر حجازی کے نام سے لکھنا شروع کیا لیکن جلد ہی قلمی نام ساغر صدیقی اختیار کر لیا۔ لاہور میں کئی شعرا کو ان کی مقبولیت پسند نہ تھی۔ ساغر بڑی حساس طبیعت کے حامل تھے۔

مخالفانہ اور حاسدانہ رویوں پر کڑھتے تھے۔ مالی آسودگی بھی نہیں تھے۔ زیادہ تر

مزارات پر وقت گزارتے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مخالفانہ رویوں اور محبت میں نارسائی نے نشے کی لت میں مبتلا کر دیا۔ متشاعروں نے اُن کی اِس کیفیت کا خوب فائدہ اٹھایا۔ چند پیسوں کے عوض اُن کا قیمتی ادبی اثاثہ لے جاتے۔ ساغر بہت زود گو تھے۔ اُن کا بہت سا کلام ضائع ہوا یا کم ظرف شعرا نے اپنے نام سے شائع کروالیا۔ اُن کی ابتدائی شاعری اختر شیرانی کے رنگ میں تھی کہ اُس دور کا یہی مقبول رنگ تھا۔ بعد ازاں جب ساغر نے دنیا کے چلن کا تجربہ کیا تو کلام میں دکھ، تکالیف، درد، جبر اور کرب نمایاں ہوا اور ساغر کا یہی کلام عامتہ الناس میں سراہا گیا۔ اُن کا یہ شعر اُن کی زندگی کا خلاصہ ہے:

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

انور کمال پاشا اور مبارک علی خان انہیں فلمی گیت نگاری کی طرف لائے۔ انہوں نے غلام، سرفروش، باپ کا گناہ، باغی، جبرو، باپ کا گناہ، انوکھی داستان وغیرہ کے گیت لکھے۔ اکثر نغمات کو شہرت ملی مگر یہ جلد فلم نگری کی چکا چوند سے اکتا گئے ورنہ دبستانِ فلم کو بہترین گیتوں کا مزید سرمائے دے کر جاتے۔ فلمی دینا میں اُن کی آمد عجیب انداز میں ہوئی، موسیقار مبارک علی خان فلم ''دو آنسو'' کے لیے گیت کا ایک مکھڑا سروں میں سیٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نغمہ نگار طالب بدایونی تھے۔ ساغر اُن کی پریشانی بھانپ گئے اور بول پڑے کہ مکھڑا یوں نہیں یوں بنتا ہے اور گنگنانے لگے ''کوئی اپنی نشانی دے گیا دل لے گیا'' انور کمال پاشا کو مکھڑا اتنا پسند آیا کہ بقیہ گیت بھی ساغر ہی سے لکھوائے۔ زندگی میں جن شخصیات سے قریبی تعلقات رہے اُن میں امین گیلانی، نفیس جلیلی، احمد راہی، اور ظہیر کاشمیری کے نام آتے ہیں۔

ساغر نے غزل، نظم، قطعات اور رباعیات کی صورت میں خاصا ذخیرہ چھوڑا افسوس بے حسوں کے معاشرے میں اُن کا بیشتر کلام لوگوں نے اپنے نام سے چھپوالیا۔ اُن کی غزلیات کے ۵ مجموعے تو اُن کی زندگی میں لاہور سے اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔ زہرِ آرزو (۱۹۶۰ء)، غمِ

بہار (۱۹٦۴)، لوحِ جنوں (۱۹۷۰ء)، شبِ آگہی (۱۹۷۲ء) اور تیشۂ دل (۱۹۷۲ء)، مقتلِ گل کے نام سے بھی اُن کا مجموعہ شائع ہوا۔ سبز گنبد اُن کے نعتیہ کلام پر مشتمل تھا۔ ۱۹٦۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں اُنہوں نے ترانے بھی لکھے:

انتخابِ آرزو ہیں فتح و نصرت کے چراغ
ہیں فروزاں خونِ دل سے ملک و ملت کے چراغ

.انتہائی کسم پرسی کی حالت میں ۱۹۷۴ء میں انتقال ہوا۔ ساغر کی زندگی ہماری معاشرتی اور سماجی سفاکیت کی علامت کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ یزدانی جالندھری نے اُن کا یہ قطعۂ تاریخِ وفات کہا جس میں اُنہوں نے ساغر کی نعت نگاری میں حُبِ رسول ﷺ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔:

ساغر نے رختِ زیست جہاں سے اٹھا لیا
افسردہ اُس کے غم میں ہیں یارانِ انجمن
وہ شہرِ یارِ شعر، وہ درویشِ بے ریا
نظمیں تھیں جس کی مظہرِ معراجِ فکروفن
نعتوں میں جس کی جذبۂ حبِ رسول ؐ تھا
غزلوں میں جس کی حسن و جوانی کا بانکپن
یزدانی حزیں نے لبِ جام رکھ کے ہاتھ
''تاریخِ رحلت اُن کی کہی'' ساغرِ سخن

(یزدانی جالندھری)

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ناقدریٔ عالم، محبت میں ناکامی اور صحبت کے اثرات نے اِس عالی دماغ شاعر کو نشے کی لت میں مبتلا کر دیا۔ ہائے ہائے بڑا ظلم ہوا مگر بے حد خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ ساغر نعت گوئی کے وقت حیران کُن حد تک بیدار مغز دکھائی دیتا ہے۔ میں اگر کہوں کہ وہ

بیدار حسیات کا نعت گو ہے تو اِس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ ایک طرف تو وہ بڑی وارفتگی اور سپردگی کی کیفیت میں نعت کہتا ہے تو دوسری طرف اُس کے شعور و ادراک کی ساری حسیات مکمل طور پر بیدار ہوتی ہیں اور اُس ہی کا شعر ساغر کے نعتیہ کلام پر صادق آتا ہے:

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

زندگی کے آخری برسوں میں ساغر نے زیادہ تر نعت ہی کہی۔ اُن کی نعتیں سادگی، روانی اور صفائی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اُن میں خیال وفکر یا اسلوبِ بیاں کی کوئی پیچیدگی نہیں۔ اندازِ بیاں میں بڑی مٹھاس ہے۔ قاری اور سامع اُن کی لذّت میں کھو جاتا ہے۔ کسی شعر کی یہی اہم صفت ہوتی ہے کہ وہ فصیح اور شعریت کا حامل ہو چاہے اسلوب بیاں میں سادگی ہو یا لفظ بندی، استعارے اور علامت کی پیچیدگی ہو۔ ''سبز گنبد'' کے درویش شاعر کے کلام کا یہی وصف ہے کہ وہ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ موصوف کے جذبے اور احساس نے اشعار کو حسن و جمال سے آشنا کیا ہے۔

ہمارے ہاں اتاولے پن میں بہت سے نعت گو، ایک بار نعت کہنے کے بعد شاید دوسری دفعہ اُس پر غور کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نعت مقدار کے اعتبار سے بہت کہی جا رہی ہے مگر نعت میں جمالیاتی عناصر کا خیال نہیں کیا جاتا۔ ہمیں چاہیے تو یہ کہ نعت نگاری پر بے حد محتاط شاعرانہ رویہ اختیار کریں کہ اِس صنف ادب کا تعلق ادب کے ساتھ ساتھ مذہب سے بھی ہے۔ نعت ایک تحفہ ہے جو مومن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بصد عقیدت و احترام پیش کرتا ہے اور تحفہ تو کسی عام انسان کو بھی دیا جائے تو بہترین چیز تحفے میں پیش کی جاتی ہے۔

اللہ کریم خود بھی حسین ہے اور حسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔ اُسے کیسے گوارا ہوگا کہ کوئی کم تر چیز اُس کے حبیب کی خدمت میں پیش کی جائے۔ ساغر نے نعت نگاری کو اپنایا اور حُبِ

رسول ﷺ کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آبِ حیات کے نہیں کوثر کے جام کے منتظر ہیں۔ کہتے ہیں میں نے سبزِ گنبد کے احترام میں جو اشعار کہے ہیں وہ زندگی کے اندھیروں میں جگمگا کے روشن ستارے بن گئے ہیں ۔نعت بھی حضوری کا سلسلہ ہے کہ اِس میں بھی ہر دردمند دل آقاؐ سے اپنی کیفیت بیان کرسکتا ہے اور پھر ایسی نعوت جن میں شاعر کہتا ہے کہ میرے اشعار مہ و انجم کی مثل ہو گئے ہیں وہ حضورؐ کے قریب کر دیتی ہے کہ اِس میں کئی حوالوں سے پیغمبرِ آخرالزماں ؐ کی مدحت بیان کی جاتی ہے۔آپؐ سے متعلق تلمیحات ہوتی ہیں جن سے کئی ایک واقعات،غزوات اور معجزات ذہن کے افق پر روشن ورخشاں ہو جاتے ہیں۔''سبزگنبد'' کا خالق کہتا ہے کہ نعت کہتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ روشنی نے ہر طرف سے میرا احاطہ کرلیا ہے۔ذرّہ ذرّہ صد رشکِ طور ہو گیا ہے۔

ہمیں ضرورتِ آبِ بقا نہیں ساغر
ہمارے سامنے کوثر کا جام رہتا ہے
سبز گنبد کے لیے اشعارِ ساغر مرحبا
جگمگا کے زندگی کے ماہ پارے ہو گئے
جب بھی نعتِ حضورؐ کہتا ہوں
ذرّے ذرّے کو طور کہتا ہوں

ہمارے ہاں نعت گو کچھ نیا مضمون باندھنے یا چونکا دینے کے لیے بعض حیران کُن مضامین باندھتے ہیں۔ خاص طور پر واقعہ معراج کے حوالے سے ہماری نعوت میں عجیب عجیب مضامین ملتے ہیں کہ اللہ کریم کو کائنات کے معاملات میں مشاورت درکار تھی،عبد و معبود کی تشکیل کے مضامین، اللہ کریم حضور پاک ﷺ کے دیدار کا مشتاق تھا۔ یہ تو مجازی عشق میں گوشت پوست کے محبوب کے حوالے سے محبّ کا رویہ ہوتا ہے شعرا نے غزل اور نعت کی پاکیزگی میں فرق ہی مٹا دیا۔ پھر ایک نعت گو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ پاک نے کہا یہ عرش تمہارا گھر ہے لہذا اپنے گھر

میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔معراج کے موقع پر تصوراتی وخیالی منظر کشی اور اُس کے حوالے سے طرح طرح کی خیال آرائی غلو اور خلافِ حقیقت ہے۔

معراج میں اللہ تعالٰی نے حضورِ اکرم ﷺ کو اپنی نشانیاں دکھانے کے لیے فلک الافلاک کی سیر کرائی تھی۔اسی بات کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے۔اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے ۔معراج کی تفصیلات قرآن کریم میں موجود ہیں اور تفاسیر میں معراج کی روایت صحیح احادیث کی روشنی میں ملتی ہے۔ ایسے مضامین کی تفصیل ہمارے عہد کے نام ور محقق،تنقید نگار اور نعت گو ڈاکٹر عزیز احسن کے نقدِ نعت پر لکھے گئے مقالات میں پڑھے جا سکتے ہیں۔اب اُن کے کوئی ۳۰ منتخب مضامین ''حمد ونعت کے تنقیدی زاویے'' کے نام سے شائع بھی ہو رہے ہیں۔شاعر کے نام کے بغیر ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

محمد ﷺ عرش پر بیٹھے ہیں چپ خالق یہ کہتا ہے
تمھارا گھر ہے اپنے گھر میں شرمایا نہیں کرتے

ساغر صدیقی نے نعت نگاری میں بے حد محتاط شاعرانہ رویہ اختیار کیا۔کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو آداب کے منافی ہو۔جس سے شرک کا کوئی پہلو نکلتا ہو یا جو قران،حدیث،واقعات و معجزاتِ رسول ﷺ سے متصادم ہو۔اسلام کی روح کے منافی ہو۔

اُن کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے جو واقعہ معراج کو بنیاد بنا کر کہے گئے ہیں۔

کہکشاں ہے تیرے راہوارِ مقدس کا غبار
تیرے نقشِ پا میں فردوسِ بریں کے لالہ زار
خالقِ کون و مکاں کے رو برو تیرا مقام
اے غریبو ں اور ناداروں کے رکھوالے ، سلام

اَن اشعار میں کوئی ایسی بات نہیں جو محیر العقل یا بعید از قیاس ہو۔شاعر نے نبی پاک ﷺ کے سفر کی عظمت بیان کی ہے کہ اُس عظمت آثار سفر میں کہکشائیں بھی آپ ؐ کی مقدس

سواری کے سموں سے اڑنے والی گرد و غبار بن گئی یعنی آپ کہکشاؤں سے آگے بڑھ گئے ۔غریبوں اور ناداروں کے آقاؐ، مالکِ ارض و سما سے ہم کلام ہوئے۔مہ و انجم کی تابانیاں اِس حقیقت کی گواہ ہیں کہ حضورؐ اِس راستے سے تشریف لے گئے تھے۔ہمارا شعور اُس انتہا تک پہنچ ہی نہیں سکتا جہاں سے آگے جانے پر قدسی بھی عاجز وہاں کی حقیقتوں سے صرف آپؐ ہی کی ذات واقف ہے۔

ایک شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کے قدموں کے ذرّات ہی سے کہکشاؤں نے جنم لیا۔آپؐ کو اُس بلندی پر دعوت دی گئی کہ جنت چمن زار بھی آپ کے نقشِ قدم بن کے پیچھے رہ گئے۔ہر بلندی اُن کے آگے پستی بن گئی۔اللہ کریم نے آپ کو معراج پر بلا کر گویا انسانیت کو رفعت اور عظمت بخشی۔اسی لیے اقبال نے کہا تھا:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰؐ سے مجھے کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ملکِ عرب کی سرزمین پر آپؐ کی آمد کا فیضان تھا کہ بگڑے ہوئے راہِ راست پر آ گئے۔ڈوبے ہوئے ابھرنے لگے۔وہ جو صنم خانوں کے پجاری تھے خدائے یکتا و واحد کے نام لیوا ہو گئے۔انسان کا نصیب چمک اٹھا۔خارزار گلستان بن گئے:

شرف اک کملی والے نے جنہیں بخشا ہے قدموں میں
وہ صحرا بن گئے ہیں گلستاں، ایمان ہے میرا

آپ کی کرم فرمائی جوش میں آئی اور تہی دست، قلاش اور فاقہ کش سبھی صاحبِ ثروت اور غنی ہو گئے ۔آپ نے جس ذرّے پر چشمِ کرم ڈالی ستارہ ہو گیا۔جس قطرے کو نوازہ دریا اور سمندر بن گیا۔آپ کی نظروں کا فیضان ہے کہ جہالت منہ چھپانے لگی مکتبِ محمدﷺ سے بہرہ مند ہونے والے فہم و فراست والے بن گئے، خردمند اور شعور والے گئے۔

آپ کی کرم گستری تھی کہ مردہ دلوں کو زندگی کی نوید ملی۔ساغر صدیقی کو اُس انقلابِ محمدیﷺ کا مکمل احساس اور ادراک تھا کہ جس نے عالمِ انسانیت کا طرزِ زندگی بدل ڈالا۔تمام

انبیا کرامؑ نے دنیا میں تشریف لا کر انسانیت کو جو تعلیمات دیں اُن میں جو مشترک پیغام تھا وہ اللہ کی یکتائی اور وحدانیت کا تھا۔ انسان کو اصنام، شجر و حجر، چاند سورج اور آگ وغیرہ کے سامنے سجدہ کرنے سے روک کر اللہ کی بارگاہ میں کھڑا کرنا تھا۔ ساغر کہتا ہے کہ آپ نے پاک پروردگار کے ذکر سے کائنات کو سجا دیا۔ دنیا میں تشریف لا کر توحید کا چراغ روشن کیا اور کفر و شرک کے اندھیروں کو دور کیا۔ خدا پرستی کا پیغام دے کر ایمان اور یقین کی وہ شمع روشن کی جس نے دلوں کے تاریکیاں دور کر دیں۔ ہدایت کے اجالے عام ہوئے اور بھٹکے ہوئے انسانوں نے اپنی درست منزل اور سمت کا تعین کیا۔

یوں کہنا چاہیے کہ آپ نے انسانیت کی کشتی کا کھویا بن کر ناؤ کنارے لگا دی۔ آپؐ ہی اللہ کی ذات تک رسائی کا وسیلہ بنے۔ انسان کو آپ نے بصیرت کی وہ روشن بخشی جس میں انسان نے اپنے حقیقی معبود کو پہچانا۔ ''سبز گنبد'' کے خالق کی وہ نعت ملاحظہ کیجیے جسے بیسیوں نعت خواں دینی محافل کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر پڑھ کر داد سمیٹتے ہیں۔ نعت کی اسلوبیاتی سادگی، روانی اور تاثیر کی داد دیجیے۔ خیال، فکر اور تلفیظ کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لیجیے، کہیں کوئی بات افراط و تفریط کا شکار نہیں۔ تاریخِ اسلام، قران، احادیث اور اسلامی تعلیمات کے اعتبار سے بھی گرفت ممکن نہیں۔

مختصر یہ کہ یہ شہ پارہ سادگی میں تخلیقی حسن و جمال کا نمونہ ہے۔ کوئی شعر معنوی اعتبار سے ایسا نہیں کہ قران و حدیث سے متصادم ہو۔ صداقت شعاری کے ساتھ نعت کہی گئی ہے اِس لیے غلو سے مبرا اور طہارتِ فکر کی عکاس ہے:

بزمِ کونین سجانے کے لیے آپؐ آئے
شمعِ توحید جلانے کے لیے آپؐ آئے
ایک پیغام جو ہر دل میں اجالا کر دے
ساری دنیا کو سنانے کے لیے آپؐ آئے

یک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
ایک مرکز پہ بلانے کے لئے آپ آئے
ناخدا بن کے ابلتے ہوئے طوفانوں میں
کشتیاں پار لگانے کے لئے آپ آئے
قافلے والے بھٹک جائیں نہ منزل سے کہیں
دور تک راہ دکھانے کے لئے آپ آئے
چشم بیدار کو اسرار خدائی بخشے
سونے والوں کو جگانے کے لئے آپ آئے

انسان کی عظمت آپؐ کی ہستی سے وابستہ ہے۔ آپؐ نے زمین سے تا بہ فلک سفر اختیار کر کے نوعِ بشر کو رفعت و سربلندی سے آشنا کیا۔ اِس کا ثبوت آپ کا معراج والا معجزہ ہے جو بشر کی سکت اور حد سے ماورا ہے لیکن یہ معجزہ حضورﷺ کے جلال کا ثبوت ہے۔ نبی کریمؐ اللہ کے بعد سب سے جلال و جمال والے ہیں۔ آپ کی شانِ جمیل ہے اور مُحسنِ انسانیت ہیں کہ آپ ہی کے وسیلۂ جلیلہ سے ہم نے خدا کی ہستی کو پہچانا۔ اللہ کی حمد وثنا سے مساجد گونج رہی ہیں تو یہ آپؐ کے فیضان سے ہے۔ آپ کا مقام و مرتبہ ہمارے ادراک سے اس لیے بھی برتر و بالا ہے کہ جس ہستی پر اللہ اور اُس کے فرشتے بھی درور دو سلام بھیجتے ہیں ہماری ناقص عقل اُس کے مقام و مرتبے کا کیا ادراک کر سکتی ہے؟۔ ہمیں انسانیت کا سب سے بڑا دستور اور ضابطہ قران کی صورت میں عطا ہوا تو آپؐ ہی کے وسیلے سے۔ ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ دو جہانوں کے والی کو ہماری آنکھ کب پہچانتی تھی۔ ہمیں شعورِ عبادت اور تہذیبِ حیات و کائنات ملی تو آپ کی وساطت سے۔ یہی وجہ ہے کہ کونین پر سردارِ انبیاؑ کی شاہی ہے۔

جاری ہے دو جہاں پہ حکومت رسولﷺ کی
کرتے ہیں مہر و ماہ اطاعت رسول ﷺ کی

محمدؐ باعثِ حسن ِ جہاں، ایمان ہے میرا
محمدؐ حاصلِ کون و مکاں، ایمان ہے میرا
ایک امّی نبیؐ گواے ساغر تاجدارِ شعور کہتا ہوں

نعتیہ شاعری کی بنیاد ذاتِ مصطفےؐ سے محبت وعقیدت کا جذبہ ہے۔ یہ نعت گوئی کا تقاضا ہی نہیں ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ہمارا ایمان اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک ہم اپنی ہر چیز اپنے تمام رشتوں سے زیادہ نبیﷺ کی ذات سے محبت کرنے اور اُن کا اتباع کرنے والے نہ بن جائیں۔ یہ بات یادرکھنے والی ہے کہ اطاعت میں مجبوری کا پہلو بھی ہوسکتا ہے۔ اتباع میں پیروی محبت اور اپنی خوشی سے ہوتی ہے۔ یہ ہماری تقدیسی شاعری کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ اِس میں زیادہ تر داخلیت کا عمل ہوتا ہے مگر عقیدت ومحبت کا تقاضا ہے کہ محبوب سے وابستہ ہر ہر چیز، شخص، مقام سے بھی محبت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت نگاری کا دائرۂ کار ہرگز محدودیت کا شکار نہیں۔

اگرچہ نعت کا تعلق ایک ہی ہستی سے ہے مگر اُس کے حوالے سے مدحت وثنا کی صورت میں کچھ بھی لکھا جائے، چاہے سراپا نگار، سیرت نگاری، واقعات ومعجزات، سنت وحدیث کا بیان، اخلاقِ حسنہ، بعثت، انقلابِ محمدی کچھ بھی ہو، وہ نعت ہی شمار ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ساغر صدیقی آبِ بقا کے نہیں جامِ کوثر کے تمنائی ہیں۔ خاکِ بطحا کو آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہتے ہیں، خود کو وارفتگانِ بطحا میں شمار کرتے ہیں۔ حضوری کی تڑپ اور اضطراب ہے۔ محمدﷺ کے نام کی مالا جپتے رہنا چاہتے ہیں۔

چوں کہ عشقِ نبیؐ کا سلقہ اور بہترین قرینہ یہی ہے اُن کی آنکھوں میں مکہ اور مدینہ بسا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جس جس کے لبوں پر حضور عالی مقامؐ کا نام رہتا ہے اسے راہِ خلد کا مسافر سمجھو۔ وہ حبِ رسولﷺ کو ایمان کا دوسرا نام اور جنت کا راستہ خیال کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بالکل قرانی احکامات کے مطابق مضمون باندھا ہے کہ رسولﷺ کی چاہت اللہ ہی کی چاہت

ہے۔دراصل یہ حضور کے کرم اور آپؐ سے عشق و محبت کا سچا جذبہ ہی تو ہے جو خوشبو بن کر نعتیہ کلام میں مہکار پیدا کر دیتا ہے۔ساغر کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ایمان ایک نام ہے حُبِ رسولﷺ کا
ہے خلد کی بہار محبت رسولﷺ کی

دامانِ عقل و ہوش سہارا نہ دے مجھے
چاہت خدا کی بن گئی چاہت رسولﷺ کی

ہمیں نہ چھیڑ کہ وارفتگانِ بطحا ہیں
ہمیں تو شوقِ مدینہ مدام رہتا ہے

میں ہوں اور یادِ مدینہ اور ہیں تنہائیاں
اپنے بیگانے سبھی مجھ سے کنارے ہو گئے

غارِحرا ہی وہ مقام ہے کہ جس نے اوّل اوّل نورِ نبوت کی زیارت کی۔حرا کے آفتاب کے جلوے کس درجہ عالم افروز تھے کہ جن کے نور سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ تابندہ ہو گیا۔یہ وہ مقام ہے کہ جہاں آپ دیر تک تنہائی میں نہ صرف عبادت کرتے بلکہ انسانیت کے لیے آنسو بہاتے۔حالی نے کیا خوب بات کہی تھی کہ آپ غارِحرا سے انسانیت کی راہنمائی کے لیے ایک نسخۂ کیمیا ساتھ لے کر آئے۔

وہاں سے پھیلنے والی تہذیب اور ہدایت کی روشنی نے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کر دیا۔ساغر صدیقی نے اپنے اشعار میں رسولِ خداﷺ کی عبادات کا تذکرہ کیا ہے۔اُن کی نظر میں جو انسان امت کے غم میں اشک فشانی کرنے والی ہستی سے محبت کرتا ہے وہ خدا کا راز داں ہے۔خدا کی ہستی کو پہچانتا ہے۔اُس کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔

غارِ حرا کو یاد ہیں سجدے رسولﷺ کے
دیکھی ہے پتھروں نے عبادت رسولﷺ کی

محبت ہے جسے غارِ حرا میں رونے والے سے
وہ انساں ہے خدا کا رازداں، ایمان ہے میرا

ساغر محبوبِ خدا کے نغمہ سرا ہیں۔ احمد مجتبےٰ ﷺ کے حوالے سے مدحت کے جتنے بھی موضوعات ہیں اُن میں حضورؐ سے عقیدت ہی کا اظہار ہے جو نعت کے زمرے میں آتا ہے لیکن آج کے پُر آشوب دور میں جب انسان سے قلبی و ذہنی سکون کی دولت چھن گئی ہے۔

امتِ مسلمہ دنیا میں رسوا اور خوار ہے۔ اسلام دشمن قوتیں ملت اسلامیہ کو دکھ اور تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتیں۔ ہمارے آپس کے اختلافات کی کوئی حد ہے نہ اُن کا شمار۔ حقیقت ہے کہ کیفیت ظہورِ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت والی ہو گئی ہے۔ ایسے میں کوئی ہماری راہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے زخموں کا مداوا کر سکتا ہے تو وہ ہمارے پیارے رسول ﷺ کی با کمال اور بے مثال سیرت ہے۔ ہم بھٹکے ہوؤں کے لیے آپؐ کی سیرت ہی خضرِ راہ بن سکتی ہے۔ ہمارے تمام تر مسائل اور مشکلات کا حل آپ کی سیرت پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ ہم اپنی کشتِ ہستی کو سرسبز و شاداب کرنا چاہتے ہیں تو رحمتِ عالم کی سیرت اور سنت کو سرمایۂ حیات بنا لیں۔ ساغر صدیقی کا کہنا ہے کہ آپ کی ذات چشمۂ صفات تھی۔ ہر زمانے کے دکھ درد اور کرب میں مبتلا انسانوں کے لیے اپس میں شفا اور مداوا ہے۔

مصائبِ حیات کی کڑی دھوپ میں جھلستے ہوئے انسانوں کے لیے آپ کی بے سایہ ہستی، خنک سایہ ہے۔ آپ بنجر دلوں کے ہر نخلِ خشک کو فصلِ بہار دے سکتے ہیں۔ آپ امید کا استعارہ ہیں کہ آپ کی سیرت گھر اندھیرے میں صبح تجلیات کی مانند ہے۔

ساغر اپنے تخلص کا استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے در پہ جھک جائیں اور آپ کی ذاتِ گرامی سے استفادہ کریں تو ہماری حیاتِ بے ثمر کے ساغر سرور و کیف سے بھر جائیں گے۔

سرمایۂ حیات ہے سیرت رسول ﷺ کی
اسرارِ کائنات ہے، سیرت رسول ﷺ کی
بنجر دلوں کو آپؐ نے سیراب کر دیا
اک چشمۂ صفات ہے، سیرت رسول ﷺ کی
تصویرِ زندگی کو تکلم عطا کیا
حسنِ تصورات ہے، سیرت رسول ﷺ کی
ساغرِ سرور و کیف کے ساغر چھلک اٹھے
صبحِ تجلیات ہے، سیرت رسول ﷺ کی

چمن زاروں کے لالہ وگل آپ کے حسن کا عکسِ جمیل ہیں۔ عالمِ انسانیت کی تمام تر روشیاں اور رعنائیاں آپؐ کے طفیل ہیں۔نعت نگاروں نے سچ کہا کہ آپ کائناتِ حسن بھی ہیں اور حسنِ کائنات بھی۔ اجرامِ فلکی کی تابندگی آپ کی منت کش ہے۔

معطر کر گئے ساغر فضائے گلشنِ ہستی
نبیؐ کے گیسوئے عنبرفشاں ، ایمان ہے میرا

وہ شقاوت کہ فلک پیر کراہا اُس پر
اور طائف میں ترا صبر وہ شاہا آہا
(اکرم کنجاہی)

یزدانی جالندھری کا چمن زارِ نعت

سید یزدانی جالندھری کے والد بہاول شاہ کاروبار کے سلسلہ میں جالندھر چھوڑ کر ساہیوال منتقل ہو گئے تھے، یزدانی جالندھری ۱۹۱۵ء میں پیدا تو کھر لا کنگرا (جالندھر) میں ہوئے تھے مگر بچپن اور جوانی ساہیوال میں گزری۔ میٹرک کے بعد ادیبِ فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کراچی میں مقیم افسر امروہوی جو ایک اسکول میں استاد تھے، اُن سے بذریعہ ڈاک کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ ماہ نو، نیا راستہ (دہلی)، شاہکار (لاہور) اور جام جہاں (لکھنو) میں کلام شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۸ء میں رباعیات کا مجموعہ ''ساغرِ انقلاب'' کے نام سے شائع ہوا۔ اسی سال لاہور منتقل ہو گئے اور فلمی اخبار ''فلمستان'' کے ادارت سنبھال لی۔ ۱۹۴۵ء میں بمبئی منتقل ہوئے اور وہاں ''اداکار'' نامی رسالے کے مدیر بن گئے۔ یہ رسالہ بند ہوا تو ۱۹۴۶ء میں عطاﷲ شاہ ہاشمی کے فلم سازی کے ادارے سے وابستگی اختیار کر لی۔ بھارت اور پاکستان میں کئی فلموں مثلاً کنیز، یہ ہے دنیا، جگر، الزام، مسکہ پالش، شکار، پیار نہ کرنادان، بارہ بجے فرنگی وغیرہ کے گیت لکھے یا مکالمے تحریر کیے یا پھر معاون ہدایت کار کے طور پر کام کیا۔

اِن کے لکھے ہوئے نغمات زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور عمر کے آخری ایام تک ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ سے منسلک رہے۔ یہ اِس وجہ سے بھی فلمی وادبی دنیا میں یاد رکھے جائیں گے کہ مہدی حسن کا پہلا فلمی نغمہ ''میرے خیال وخواب کی دنیا لیے ہوئے'' جو ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہونے والی فلم شکار کے لیے گایا گیا تھا، وہ اِن کا لکھا ہوا تھا۔ اِن کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا۔ وفات کے بعد اِن کے بیٹے نے غیر مطبوعہ کلام ''کائناتِ دل'' کے نام سے شائع کروادیا۔

جہاں تک یزدانی جالندھری کی نعت نگاری کا تعلق ہے تو اُنہوں نے غزل کی ہئیت کے علاوہ نظمیہ نعتیں بھی لکھی ہیں۔ ویسے تو اُنہوں نے تمام ہی نعتیہ موضوعات پر اشعار کہے ہیں مگر دو

موضوعات ایسے ہیں جن پر خصوصیت کے ساتھ اُن کا کلام معیار کے ساتھ مقدار میں بھی زیادہ ملتا ہے۔اسلام سے پہلے دنیا کی حالت اور ظہور قدسی کے بعد برپا ہونے والے انقلاب کے اثرات، آقائے نامدار کی چشمِ کرم کے فیضان اور حاضری وحضوری کی تڑپ پر بڑے دل گداز نعتیہ شہ پارے کلام کے حسن اور دل کشی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

عقل وخرد بھی سر بہ گریباں تھی کہ انسان کس طرح خود ہی فضائے دہر کو مکدر کیے ہوئے ہے۔اپنے سچے خالق کو بھلا کر اوہام کے سحر میں بری طرح مبتلا ہو چکا ہے حالاں کہ دنیا میں جتنے بھی انبیا کرام تشریف لائے اُن کی تعلیمات کا پہلا اور بنیادی نقطہ توحید تھا۔ آپ ؐ کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے صداقت شعاری عنقا تھی۔اخلاصِ بیاں متروک تھا۔زبان حق بات سے شناسا ہی نہیں تھی۔نوع بشر انتظارِ سحر میں تھی۔ایک ایسی تجلیات سے سجی صبح جس میں حق پرستی انسانیت کا اعلیٰ معیار ہو۔

خلیلؑ و مسیحاؑ جیسے انبیاؑ آئے مگر امام الانبیا مصطفےٰ ﷺ کا انتظار تھا۔ہر شاعر نے اپنے اپنے اسلوب اور فکر کے مطابق بعثت اور اُس کے نتیجے میں انقلابِ محمدی ﷺ پر اشعار کہے ہیں۔ شہِ جن وبشر کی آمد سے ایک نئے رنگ سے کائنات کی تزئین ہوگئی۔سوچیں بدل گئی۔حالات بدل گئے جب انسان کے فشارِ خون کا علاج ہوا۔

آدمیت کو حق کا عرفان ملا۔ذاتِ خدائے واحد جو ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں مستور تھی ،اُس سے یوں حجابات اٹھے کہ دل ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے۔انبیاؑ کے سربراہ کی آمد خوش کُن ثابت ہوئی اور یزداں شناسی کی باب کھل گئے گویا آپ ؐ مظہرِ نورِ حق بن کے تشریف لائے۔بزمِ کونین کے تاجدار، باعثِ تخلیقِ عالم، شفیع محشر نے مکہ کی وادی میں خفتہ ضمیروں کو اس طرح بیدار کیا کہ کفر ظلمت رخصت ہوا اور پریشاں حال اور مضطرب قلوب نورِ ایمان وایقان سے منور ہو گئے۔

یزدانی جالندھری نے اپنی نظمیہ نعت میں ظہور قدسی سے پہلے اور بعد کے حالات پر

وجد آفریں اشعار کہے ہیں۔ وہ حضور ﷺ کی ختمِ نبوت کا اعلان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آپ کی مقدس سواری کیا آئی عالمین کا مقدر سنور گیا۔ آپ حضرت آمنہؓ کی آغوش میں کیا تشریف لائے انسانیت کی قسمت کا ستارہ رفعتوں پر چلا گیا۔ دنیا میں سکون نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اخلاقیات اور شرم و حیا کی روح دم توڑ چکی تھی۔ ہر طرف لڑائی جھگڑا اور فتنہ فساد تھا۔ قبائل کے درمیان قتل و غارت گری عام تھی۔ انسان نے اپنے ہم جنسوں کو غلام بنایا ہوا تھا۔ نوعِ انسان گمراہ ہو چکی تھی۔ انسان سرکش اور خودسر ہو چکے تھے۔ کسی ضابطے اور قانون کے پابند نہیں تھے۔

اِس انتشار کو دیکھتے ہوئے انسانی روح پیاسی تھی اور کسی ہادئ برحق کی منتظر تھی کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ تشریف لے آئے۔ یزدانی جالندھری کے نعتیہ کلام سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جو مثنوی کی ہئیت میں ایک ہی موضوع پر ہیں:

قسمتِ عالم سنور جانے کی باری آ گئی
صاحبِ ختمِ نبوت کی سواری آ گئی
اوجِ گردوں پر مقدر کا ستارا آ گیا
آمنہ کی گود میں اک ماہ پارہ آ گیا
اک تباہی کا مرقع تھا جہانِ بے سکوں
روحِ اخلاق و شرافت شرم سے تھی سر نگوں
بربریت کی لکھی تھی ہر قدم پر داستاں
دامنِ صحرا پہ پھیلی تھیں لہو کی سرخیاں
شامِ اِستبداد کی تھی زلف لہرائی ہوئی
ہر طرف جبرِ غلامی کی گھٹا چھائی ہوئی
تھی رواں تیغِ ستم مجبور کے حلقوم پر
تھی جفائے نا روا گویا روا مظلوم پر

الغرض تھی ہر قدم پر گمرہی ہی گمرہی
سر میں انساں کے سمایا تھا جنونِ خود سری
ذہن و فکر آدمیت میں تھا برپا انتشار
تھا زمانے کو پیامِ آخری کا انتظار

ہر مسلمان شاعر کوئی زیادہ کوئی کم مگر نعتِ رسول ﷺ لکھنے کا شرف ضرور پاتا ہے۔ ہمارے عہد میں شاید ہی کوئی ایسا شعری مجموعہ شائع ہوتا ہوگا جس کا آغاز حمد و نعت سے نہ ہوتا ہو، دراصل ہر مسلمان نعت گوئی کو توشئہ آخرت خیال کرتا ہے۔ وہ نعت کو ایسا تحفہ سمجھتا ہے جسے پیارے نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے لہذا اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی بہترین فنی و فکری کاوش سرورِ کونینؐ کے دربار میں پیش کر کے سرخ رو ہو سکے۔ یزدانی جالندھری نے بھی بڑے کھرے جذبات، عشق و محبت کی سرشاری اور کامل شعور کے ساتھ نعتیں کہی ہیں۔

سراقم الحروف نے ''ہے اور میں ہوں'' ردیف میں صہبا اختر کی نعت بھی پڑھی تھی اور غالباً اُسی نعت پر محقق اور مورخ منظر عارفی کے سخت الفاظ سامنے آئے تھے جن میں اُنہوں نے اُس نعتیہ کلام کو خود ستائی کا نمونہ قرار دیا تھا مگر یزدانی کی نعت میں ایسی بے ادبی کہیں نہیں۔ مذکورہ نعت کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے:

حدیثِ مصطفے ہے اور میں ہوں
بس اک حرفِ ثنا ہے اور میں ہوں
چلے آتے ہیں خوشبوؤں کے جھونکے
مدینے کی ہوا ہے اور میں ہوں
ملا ہے مجھ کو بھی اذنِ حضوری
کرم کی انتہا ہے اور میں ہوں

اُن کی نعت صداقتوں کا صدف ہے جس میں عقیدت کے نایاب موتی ہیں۔ اُن کے

لیےنعت نگاری کا عمل بڑا سکون بخش ہے۔ یہ صرف عقیدت ومحبت نہیں شکروسپاس گزاری کا معاملہ بھی ہے۔ وہ درود وسلام کو ہر ہر پل وردِ زباں بنائے رکھتے ہیں۔ اِس لیے کہ نعت برکت و سعادت کا ایک سحر انگیز ذریعہ ہے۔اُن کا کہنا یہ ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کا ثنا خواں ہوں۔ یہ عمل تو اللہ اور اُس کے فرشتے بھی سرانجام دیتے ہیں اِس لیے قدرِمشترک کی وجہ سے میرا بھی آسمانی محافل میں ذکر رہتا ہے۔

ذکرِ خیر الوریٰ داستاں داستاں
وردَ صلّی علیٰ کارواں کارواں
میں ہوں یزدانی، اک مدح خوانِ نبیؐ
شہرتیں کیوں نہ ہوں آسماں آسماں

موصوف لکھتے ہیں کہ آپؐ کی ذاتِ گرامی بظاہر امّی لقب تھی مگر آپؐ کا سینہ علم وحکمت اورشعور وآگہی سے بھر دیا گیا تھا۔اُسی فہم وادراک کی روشنی ہے جس نے زندگی کے سب حوالوں کو روشن کیا۔ یہ حضور اکرم ﷺ ہی کا فیضانِ نظر اور اخلاقِ حسنہ ہے کہ آدمیت نے بغض وعداوت ترک کر کے بندہ پروری کے آداب سیکھ لیے۔انسان تو عجز وانکسار کے ساتھ اُن کی ثنا ہی بیان کر سکتا ہے مگر اُنکے حقیقی مقام ومرتبے کا ادراک صرف خدائے نکتہ بیں کو ہے۔ وہی محمد ﷺ کا مرتبہ دان ہے۔

یزدانی کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ کریم اپنی ذات وصفات میں بے مثال و یکتا ہے اسی طرح کونین میں آپؐ کا بھی کوئی ہمسر یا ثانی نہیں۔ پھر نعت نگار آپ کی عظمت کو واضح کرنے کے لیے سفرِ معراج کا حوالہ دیتے ہیں کہ اجرامِ فلکی اور کہکشائیں آپؐ کے قدموں کی دھول بن کر پیچھے رہ گئیں اور عرش کی رفعتوں سے آشنا کیے گئے۔شاعر کہتا ہے کہ میرے لیے یہ بے حد سعادت اور فخر کا مقام ہے کہ میں آپ کے در کے معمولی غلاموں کے غلاموں کا غلام ہو جاؤں۔ مجھے یہ نسبت عطا ہو جائے تو کیا کہنے۔

آپ فخر رسولاں اور شہ دنیا و دیں ہیں۔آپ سرداری کی رفعتوں کی روشن آفتاب و مہتاب ہیں۔آپ پر نبوت و رسالت کو مکمل کر دیا گیا۔ہم اُن صحابیوںؓ کی قسمت پر بھی رشک کرتے ہیں جو آپؐ کے چہرے کے دیدار سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔نیچے دیئے گئے آخری شعر میں لفظ ''اللہ اللہ'' اپنے درست تلفظ کے ساتھ نہیں باندھا گیا۔تقدیسی ادب اور اِس لفظ کی حرمت کو دیکھتے ہوئے ایسی اغلاط پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جس طرح یکتا ہے ذاتِ کبریا
تیراً بھی کونین میں ثانی نہیں
مہر و ماہ و نجوم، اُنؐ کے نقشِ قدم
اُن کی گردِ سفر، کہکشاں کہکشاں
آپؐ کے ادنیٰ غلاموں کے غلاموں کا غلام
ہے شرف میرے لیے اتنی بھی نسبت آقاؐ
اخترِ برجِ اوجِ سیادت، صلی اللہ علیہ وسلم
گوہرِ مہرِ ختمِ نبوت، صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ اللہ اُن آنکھوں کا نصیب ِ یاور
مصحفِ رخ کو جو کرتی تھیں تلاوت آقاؐ

نعت گوئی میں دو عناصر بے حد اہم ہیں۔ایک یہ کہ تقدیسی اظہار عقیدت و محبت کا معاملہ ہے۔عشقِ رسول ﷺ کے بغیر نعت کا تصور نہیں۔اگر ایسا نہیں تو وہ شاعر کا فن ہے اور کچھ نہیں۔دوسرا فنی و فکری اعتبار سے نعت نگاری کے تقاضے۔یہی وجہ ہے کہ حاضری و حضوری کی تڑپ مسلمان شعرا کے کلام میں اہم ترین موضوع ہے جس کے کئی پہلو ہیں۔آقاؐ کے دربار پر حاضر ہو کر روح کی پیاس بجھانا اور آپؐ کی ذاتِ اقدس سے وابستہ اشیا، شخصیات اور مقامات سے بھی اظہارِ عقیدت کہ یہ بھی عشق و محبت کے تقاضوں میں سے ہے

شعرا سب سے پہلے تو راہِ مدینہ کے مسافروں کو مخاطب کر کہ کہتے ہیں کہ سردارِ دو جہاں کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ خادم کو اذنِ حضوری عطا کیجیے۔ دوسرا نعتیہ مضمون یہ ہوتا ہے کہ وہاں پہنچ کر روزے کے سامنے کھڑے ہو کر دل کی کیفیات بیان کرتے ہیں اور تیسری بات یہ کہ واپس آ کر پھر سبز گنبد پر حاضری کی خواہش کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ، سبز گنبد اور روزے کی جالیوں پر بھی عقیدت بھرے اشعار کہتے ہیں کیوں کہ سلطانِ بحر و بر سے متعلق توصیفی انداز میں کچھ بھی لکھا جائے نعت ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ امیر مینائی کی اُس نعت کے تین چار اشعار میں حاضری کے لیے بیقراری، اضطراب اور تڑپ دیکھنے والی ہے جس میں کہتے ہیں:

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں
(امیر مینائی)

اِس نعت میں یوں لگتا ہے جیسے جسمانی طور پر ایک لا چار و لاغر شخص جس میں دو چار قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں، وہ اوروں کو مدینے کی طرف رواں دواں دیکھ کر راستے میں بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ سبحان اللہ۔ یزدانی جالندھری کے اشعار میں وہ شدتِ احساس تو نہیں ہے جو امیر مینائی کے اشعار کی خاص صفت ہے مگر اُن کے بھی دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔ اُن میں بھی شاعر کا اضطراب نمایاں ہے۔ آج کل تو ہوائی سفر نے معاملات بہت آسان کر دیئے ہیں۔ ہماری نئی نسل کو تو شاید علم بھی نہیں ہو گا کہ کسی زمانے میں حج و عمرے کے لیے عشاق پیدل بھی سفر اختیار کیا کرتے تھے۔ راستے کی مشکلات اور کٹھنائیاں عشقِ رسول ﷺ کے آگے دم توڑ جاتی تھیں، عشق اپنا راستہ بنا لیتا تھا۔

یوں بیٹھ نہ جی چھوڑ کے اے عزمِ زیارت
وہ سامنے دربار ہے دو چار قدم اور

میں روزۂ سرکار پہ پہنچوں تو اجل آئے
اے صاحبِ اکرام ! بس اتنا سا کرم اور

میں یزدانی جالندھری کی ایک نعت کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں جو غزل کی ہئیت میں کہی گئی ہے مگر اُس میں مکمل طور پر ایک ہی کیفیت کا اظہار ہے۔ایک ہی فضا ہی۔فکر میں روانی اور بہاؤ ہے۔نعت کا مرکزی خیال یہ ہے کہ شاعر اذنِ حضوری کا خواہش مند ہے۔

مدینہ شریف کے ایک زائر کو دیکھ کر اُس سے گزارش کر رہا ہے کہ جب درِ رسول ﷺ پر پہنچو تو وہاں جا کر لکھنا کہ پیارے رسولؐ کے مقدس شہر کے نظارے کیسے ہیں۔حضورؐ کے پاک روزے کی جالیاں کس قدر خوب صورت ہیں۔مسجد نبوی کی مینار کتنے عظیم اور شان دار ہیں۔

وہاں کی فضا میں ہر وقت کرم کی بارش کا منظر کیسا ہوتا ہے۔بصد عجز وانکسار وہاں میرا سلام عرض کرنا پھر بتانا کہ اذنِ حضوری ملا؟

جانے والے مجھے طیبہ کے نظارے لکھنا
کتنے جاں بخش ہیں کس درجہ ہیں پیارے لکھنا
جالیاں روضۂ اطہر کی ہیں کتنی دل کش
کیسے ہیں مسجدِ نبوی کے منارے لکھنا
لطف و رحمت کی برستی ہیں گھٹائیں کیا کیا
کس طرح ہوتے ہیں رحمت کے اشارے لکھنا
کیسے ہوتاہے دل و روح پہ بارانِ کرم
کیسے بہتے ہیں وہاں نور کے دھارے لکھنا
عرض کرنا مری جانب سے بصد عجز و سلام
اُنؐ کی جانب سے ہوں پھر جو بھی اشارے لکھنا

اُن کے کلام میں عشق ومحبت کے پُر خلوص جذبات لیے ہوئے اشعار کی بھی کمی نہیں۔

جن میں شاعر گنبدِ خضری سے پھوٹنے والے انوار کو اپنی آنکھوں کی بصارت قرار دے رہا ہے۔کچھ تصوراتی اشعار بھی ہیں جن میں شاعر خیالی طور پر درِ خیر الوریٰ پر ہے اور اُن پُر کیف مناظر سے لطف اٹھا رہا ہے۔ایسے اشعار میں بے حد احتیاط اور ہنر مندی چاہیے ہوتی ہے کہ تصوراتی مناظر میں غلو شامل نہ ہو جائے۔

خاص طور پر شفاعت کے موضوع پر کہے گئے اشعار میں محشر کے تصوراتی مناظر کو پینٹ کیا جاتا ہے۔شفاعت پر ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ شافع محشر ہیں مگر کچھ شاعر تو شفاعت کو اِس طرح کلام میں باندھتے ہیں جیسے یہ واقعات وقوع پذیر ہو چکے ہیں اور حضور نے انہیں شرمندگی سے بچا لیا ہے اور سیاہ کاریوں کو کالی کملی میں چھپا لیا ہے۔یہ خلافِ واقعہ باتیں ہیں جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا۔

عجب عالم ہے یزدانی سر حشر
شفاعت کی گھٹا ہے اور میں ہوں

نعت گو نے بہر حال اپنی طرف سے مندرجہ ذیل اشعار میں احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔مذکورہ موضوعات پر چند نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کاش مل جائے اذنِ حضوری مجھے
میں بھی پہنچوں وہاں کامراں کامراں

تصور پُر کشا ہے اور میں ہوں
درِ خیر الورا ہے اور میں ہوں

طوافِ انوارِ گنبدِ خضری
میری آنکھوں کی روشنی کا بھرم

مسلمان ہر مشکل، دکھ اور تکلیف کی گھڑی میں امام امم سے ہی مدد مانگتے ہیں۔چشمِ نم سے اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔گویا آپؐ کے حضور ندامت کے آنسو بہاتے ہیں۔لکھاری

زبانِ قلم سے بھی عرضِ حال کرتے ہیں۔آپؐ کے اعلیٰ مقامات کا واسطہ دیتے ہیں کہ اے بے آسروں کے آسرا، اے امامِ صفِ انبیاءؑ! انجمن انجمن آپ کی جودوسخا کے تذکرے ہیں۔

اپنی نظرِ کرم کا ابر برسایئے تا کہ ہم پیاسوں کے جسم وروح کی تشنگی دور ہو سکے۔یزدانی صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار پر غور کیجیے اُن میں بھی شاعر دربارِ نبیﷺ پر دست بستہ کھڑا ہو کر استدعا کر رہا ہے کہ اے شان والے سبز گنبد کے مکیں میں اپنا غم گین دل اور پُرنم آنکھیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔اللہ کریم کے بعد آپ ہی کا مقام ومرتبہ بھی ہے اور اے عاصیوں کی شفاعت کرنے والے آسرا بھی اللہ کے بعد آپ ہی کی ذات کا ہے۔

میں آپ کے در کے سوا کہاں جاؤں کس سے امید رکھوں؟ مجھ بے کس ولاچار کی شنوائی فرمایئے میرے قلبِ پریشاں کو آپ ہی پناہ گاہ دکھائی دیتے ہیں۔اے انیسِ غم زدگاں چارہ سازی کیجیے:

سن تو لے رودادِغم اے سبز گنبد کے مکیں
لے کے آیا ہوں دلِ اندوہ گیں اور چشمِ تر
اے کہ ہے بعد از خدا ہم کو ترا ہی آسرا
جائیں تو جائیں کہاں اب تیرے در کو چھوڑ کر
اپنے اس یزدانیؔ بے کس پہ بھی
اک نظر ہو یا شفیع المذنبیں

ہمیں خدا نے ایک ایسا نبیؐ دیا کہ جس نے انساں کو شعورِ حیات دیا۔زندگی سکھانے کے لیے نئے ضابطے اور نئے قوانین دیئے۔زمانۂ جہالت کی قدیم رسموں اور رواجوں کو موقوف کر دیا۔توحید کی ایسی ضرب لگائی کہ اصنامِ جہاں پاش پاش کر دیئے۔ انسان کو اُسوۂ حسنہ کا درس دیا۔ اخلاقیات کی دولت عطا کی۔جس جس نے آپ کے در کی گدائی کی اُس کو ایسی سلطنتِ فقر عطا ہوئی کہ وہ گدا سے شاہ ہو گیا۔اُس نے پھر کسی بادشاہ کی صحبت کو بھی حسرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

خسروی اُس کی نظروں میں ہیچ ہوگئی۔اُن کی نظر میں عرشِ بریں کے جلوے بھی کیسے ٹھہر سکتے تھے کہ اُنہیں سلطانِ انبیاؐ نے عرفان وآگہی کی روشنی سے فیض یاب کر دیا تھا۔

افلاس کو عزت وشرف اور غریب و بے نوا کو اعتبار بخشا۔رنگ ونسل کا فرق ایسے مٹایا کہ حضرت بلال حبشیؓ سیّدنا ہو گئے ۔ امت کے پہلے موذن کا اعزاز پا گئے۔نعت گو یزدانی جالندھری بھی کہتے ہیں کہ میں بھی فیض یافتہ ہوگیا ہوں۔اب میری تمنائیں میری آرزوئیں بے ثمر نہیں ہیں۔اب میرے شہرِ تمنا میں کوئی گوشہ بھی تاریک نہیں۔ اِس شہر میں اب اجالے ہی اجالے ہیں۔آپ کی کرم گستری ہے کہ عطا کے گلشن آباد ہیں۔

آپ کے احسانات دونوں جہانوں میں ہیں۔دنیائے آب و گِل میں آپ کے نعلین کے صدقے انسان مثلِ کوکب وخورشید ہوئے۔

آپ نے ذہنوں کی سوچ کو شاداب کیا۔ایسی خردمندی دی کہ اُن انسانوں کے لیے حیاتِ چار روزہ کا تصور ہی بدل گیا۔روزِ محشر بھی عاصیوں کو آپ ہی سے شفاعت کی امید ہے کہ یزدانی لکھتے ہیں کہ اِس دنیا میں بھی آپؐ کے سوا کوئی ''مامن'' یعنی پناہ گاہ نہیں اور حشر کے روز بھی ہم سیاہ کاروں کے لیے آپؐ ہی کے دامان کا سایہ ہوگا۔ اِس کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہوگی۔ مزید لکھتے ہیں کہ آپؐ ابرِ کرم ہیں،آپؐ عطا اور بخشش کے سمندر ہیں۔آپ کی رحمتوں کی حد ہے نہ کوئی شمار۔آپؐ نے ایسی نظرِ کرم کی کہ خادموں کے لیے فرِّ قیصری بھی بے حیثیت ہوکر رہ گئی۔

آپؐ کے خادموں کی نظروں میں
ہیچ ہے فرِّ قیصری کا بھرم
ہو گئی آپؐ کی نگاہِ کرم
رہ گیا اپنی بے کسی کا بھرم
ایک تیرے سایۂ دامانِ رحمت کے سوا
کوئی مامن ہے زمانے میں نہ ہے رختِ سفر

لاکھ عصیاں کار ہیں پھر بھی تری امت تو ہیں
اپنی امت کی طرف آقاؐ !عنایت کی نظر
اک نظر جو چارہ سازِ صورتِ حالات ہو
جس سے ہو ضو بار مستقبل کی تابندہ سحر
ذکرِ ابرِ کرم ، آپؐ بحرِ عطا
آپؐ کی رحمتیں بیکراں بیکراں
حشر میں ہم سے گناہ گا روں کا مامن ہو گا
آپؐ کا سایۂ دامانِ شفاعت آقاؐ

عشقِ رسول ﷺ نعت گوئی کے بنیادی تقاضوں سے ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ عشقِ احمدِ مرسل ﷺ دین کی اساس ہے۔۔جب تک دل میں حبِ نبیؐ دل میں تابندہ نگینے کی طرح نہ ہونعت کے اشعار میں تابانی آتی ہی نہیں۔لب پر درود وسلام کے ترانے نہ ہوں تو نعتِ پاک میں مہک کہاں سے آئے گی۔

لہذا خوش بخت ہے وہ دل جو حبِ رسولؐ میں تڑپتا ہے۔مرحبا وہ آنکھ وہ یادِ حبیب حق میں پُرنم رہتی ہے۔عشاق کے قلبِ محزوں کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ دوری اور حضوری دونوں صورتوں میں آپؐ کے پاکیزہ تصورات سے باہر نہیں آتے۔ یادِ مصطفیؐ کا چراغ روشن رکھتے ہیں۔ریاض حسین چودھری کیا خوب لکھتے ہیں:

وہ سوز و گداز، عشقِ محمد ﷺ ہے جس کا نام
وہ سرمدی گلاب، بدن کے کھنڈر میں ہے

یزدانی جالندھری کے فکر وخیال کی رفعتیں عشقِ نبیؐ کی دین ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ کی محبت خدا کی زندگی کا اثاثہ اور آخرت کا توشہ ہے۔ وہ نبی پاکؐ کی محبت کو دل کی شریعت قرار دیتے ہیں،آپؐ کے عشق کو جان کی عبادت لکھتے ہیں۔

وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ جب تک کوئی آنکھ عشقِ پیمبر میں پُرنم نہیں ہے، اُسے کرم اور فیضان کا امیدوار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کے نعتیہ کلام سے اِس موضوع پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپ سے عشق میرے دل کی شریعت آقاؐ
آپؐ سے عشق ، مری جاں کی عبادت آقاؐ
اے دیدۂ نم ! عشقِ پیمبر میں ہو نم اور
سامانِ کرم، ہو گا اسی طرح بہم اور
خود آپ جو کہہ دیں اسے اپنا مرے آقاؐ
یزدانی کا بڑھ جائے زمانے میں بھرم اور

تاریخ بتاتی ہے کہ آپؐ کے خلقِ عظیم کا اعتراف غیر مسلم دانش وروں نے بھی کیا۔ جہاں انسان ذرا سی روشنی کو ترس گیا تھا وہاں میرے حضورﷺ نے اپنے عمل کے چراغ روشن کیے۔ آپ کے افعال واعمال گویا مجسم صحیفہ تھے۔ آپ کی سیرت کرب میں مبتلا انسانیت کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوئی۔ اُس نے ایک عالم کے دکھوں کا مداوا کیا۔ آپؐ کی سیرت کا ورق ورق حسنِ انسانیت کا عکاس تھا۔ سیّدِ ابرار کی احادیث اور آپ کی سنن سے استفادہ کر کے آج کے دور کا انسان زندگی اور معاشرے کو سنوار سکتا ہے۔

ہمارے نعت نگاروں کو بھی اِس بات کا کامل شعور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں تقدیسی شاعری میں حیات رسولِ انورﷺ کے دیگر گوشوں کے ساتھ ساتھ آپؐ کے خلقِ عظیم، سیرت، سنت اور احادیث کا بیان بھی اہم ترین موضوع بن چکا ہے۔ یزدانی جالندھری کے نزدیک آدمیت کا بھرم اس بات میں ہے کہ آپؐ کے اُسوۂ کامل کی پیروی کرے۔ آپ کے کردار اور آپ کی گفتار کی خوشبو سے زندگی کے چمن زاروں کو مہکائے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ جو شخص آپؐ کے در کا ہو جائے پھر وہ دنیا میں خوار نہیں ہوگا، ٹھوکریں نہیں کھائے گا۔ آپؐ کے در کا ہو جانے کا مطلب

یہی ہے کہ آپ کی سیرت اور کردار کو اپنے لیے نمونہ عمل بنا کر اُن پر عمل پیرا ہونا اور جو بھی آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا دنیا و دین میں فلاح پائے گا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپ کا اُسوہ، اُسوۂ کامل
پیروی جس کی آدمی کا بھرم
فلکِ عشق پہ چمکے مہ و اختر بن کر
جن کو حاصل ہوئی کچھ دن بھی رفاقت آقاؐ
کیا ہی گفتار ہے کیا ہی کردار ہے
عنبریں عنبریں گلفشاں گلفشاں
جس کو مل جائے سنگِ درِ مصطفےٰ ﷺ
کھائے کیوں ٹھوکریں آستاں آستاں

خاکِ طیبہ ہی میں مل جاؤں فنا ہو جاؤں
کاش اتنا میں کبھی بخت رسا ہو جاؤں
(اکرم کنجاہی)

شکیل بدایونی کا نغمۂ فردوس

بچپن میں ہم مسجد کے لاؤڈ اسپیکر میں ایک نعت بڑے ذوق اور شوق سے پڑھا کرتے تھے

نہ کلیم کا تصور نہ خیالِ طورِ سینا میری آرزو محمد ﷺ میری جستجو مدینہ

یہ نعت فلم سے مقبول ہوئی تھی۔ ہمیں بہت بعد میں پتا چلا کہ یہ نعت شکیل بدایونی کی لکھی

ہوئی ہے۔ شکیل بدایونی کا دل عشق مصطفیٰ سے سرشار تھا۔ اُنہوں نے اپنی پہلی فلم درد کے لیے بھی ایک دعائیہ التجائیہ لہجے کی خوب صورت نعت

''بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ، شاہِ مدینہ''

لکھی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ بات صرف فلمی دنیا تک محدود نہ تھی۔ وہ رسولِ کریمﷺ کے لیے جو لکھتے تھے وہ محض فن نہیں تھا، اُن کے دل سے نکلی ہوئی سچی آواز ہوتی تھی۔

۱۹۶۴ء میں اُن کا ایک نعتیہ مجموعۂ کلام ''نغمۂ فردوس'' کے نام سے دربارِ رسالتﷺ میں پیش ہو چکا تھا۔ اُنہیں اولیا اللہ سے بھی بے حد عقیدت تھی جس کا اظہار اس نعتیہ مجموعے میں دکھائی دے رہا ہے کیوں کہ نعوت کے علاوہ اِس مجموعے میں ۴ مناقب (حضرت سلطان العارفینؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت بندہ نوازؒ اور حضرت غوث پاکؒ) بھی شامل ہیں۔

عرضِ مصنف کے عنوان سے لکھے گئے اپنے ابتدائیے میں کہتے ہیں: ''مجھے مسرت ہے کہ فلمی دنیا کے رنگین ماحول میں رہ کر بھی میری نگاہیں حسنِ ظاہری کے فریب میں مبتلا نہ ہوئیں، ہوسکتا ہے کہ حسنِ ظاہری کی دل فریبیاں مجھے مسحور کرنے میں کامیاب ہو جاتیں اگر میرے محترم دوست نوشاد علی صاحب میوزک ڈائریکٹر کی نگاہِ زہد آشنا میرے لیے محتسب نہ بن جاتی اور مکرم عزم صاحب بادیدپوری کے پُرزور مذہبی مکالمے اپنی جانب متوجہ نہ کر لیتے۔

اِن احباب کی محبت سے پھر وہ ماحول جاگ اٹھا جو گزشتہ دور میں استادِ محترم و عم مکرم حضرت مولانا ضیا القادری کے فیضانِ تربیت سے مجھے حاصل ہوا تھا''۔ نغمۂ فردوس میں تمام نعوت و مناقب غزل کی ہئیت میں ہیں مگر ایک گیت نما بھی شامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

نبیوں کے سردار محمدﷺ
نبیوں کے سردار محمدﷺ
حامل صد اسرار محمدﷺ
آئینۂ انوار محمدﷺ

نبیوں کے سردار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
اللہ اللہ جذبِ محبت
خود ہے خدا کو دید کی حسرت
خالق کے دل دار محمد ﷺ
خالق کے دل دار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
خلق مجسم رحمتِ کامل
ہو گئی آساں اِس کی مشکل
جس نے کہا اک بار محمد ﷺ
جس نے کہا اک بار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
دردِ محبت نیک ارادے
حق سے لیے بخشش کے وعدے
امت کے غم خوار محمد ﷺ
امت کے غم خوار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
بحر حوادث زیست بداماں
کیسی موجیں کیسا طوفاں
نیّا کھیون ہار محمد ﷺ

نیّا کھیون ہار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
قاطع ہجراں بن کر آؤ
درد کا درماں بن کر آؤ
جینا ہے دشوار محمد ﷺ
جینا ہے دشوار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ
رخ پر شکیل اک نور ہویدا
آنکھ میں ہے طیبہ کا نقشہ
دل ہے ترا دربار محمد ﷺ
دل ہے ترا دربار محمد ﷺ
نبیوں کے سردار محمد ﷺ

مذکورہ نعتیہ مجموعے میں شاعر نے عہدِ نبوی سے پہلے زمانۂ جہالت کی اخلاقی پستیوں، ذلالتوں اور رذالتوں کا نقشہ کھینچنے کے بعد اُس ہمہ گیر انقلاب کا خوب صورتی سے ذکر کیا ہے جو آقائے دوجہاں نے برپا کیا۔ دلوں کے حسد، کینے، عداوت اور بغض کو کافور کر کے انسانیت کو محبت اور وحدت کی لڑی میں پرو دیا۔ اِس لیے آپ ﷺ نہ صرف باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں بلکہ انسانیت کے مونس و غم خوار بھی ہیں۔

آپ غربا کے سہارے ہی نہیں انسانیت کی آزادی کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ آپ کا پرتو جلوہ فگن ہے جس سے دوجہاں جگمگا رہے ہیں۔ شکیل نے آپ کے واقعۂ معراج کا لا جواب انداز میں ذکر کیا ہے۔ آپ نے عرش پر جا کر انسانیت کی عظمت بڑھا دی۔ اِس لیے جبینِ آدم آپ ہی کے نورِ خدا نما سے دمک رہی ہے۔ ''نورِ خدانما'' کی داد دینا پڑے گی کہ کمال ہُنر مندی

سے حضور کی عظمت بیان کی ہے کہ افراط سے بھی خود کو بچایا ہے اور تفریط بھی نہیں ہے۔

شاعر اِس بات پر خوش گوار حیرت کا اظہار کر رہا ہے کہ وہ ایسی ہستی ہیں کہ شاہانِ عالم اُن کے دربار میں سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں مگر وہ خود نحیف و نزار رہرو کے سامان کی گٹھڑی آگے بڑھ کر اٹھا لیتے ہیں۔ مدینہ، بعثت، سیرت، حضوری کی تڑپ، حضور کی نظر کرم کی التجا وغیرہ اُن کے اہم نعتیہ موضوعات ہیں۔

بالیقیں باعثِ تخلیقِ دو عالم تو ہے
میرا مونس مرا آقا مرا ہمدم تو ہے
جبینِ آدم دمک رہی ہے انہی کے نورِ خدا نما سے
یہی جو عرشِ بریں پہ جا کر بشر کی عظمت بڑھا رہے ہیں
یہی وہ ہیں جن کے آستاں پر ہیں تاج والے بھی سر بہ سجدہ یہی
وہ ہیں جو نحیف رہرو کا بوجھ سر پر اٹھا رہے ہیں محمد مصطفےٰ ﷺ
کی سیرتِ اقدس کا کیا کہنا
شہ دیں بن کے دنیا کو دکھا دی سادگی اپنی

شکیل بدایونی سے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر وہ غزل کہتے اور فلمی گیت نگاری کی طرف نہ جاتے تو اُردو ادب کو ایک اور جگر مُرادآبادی مل جاتا لیکن اُس صورت میں دبستانِ فلم کو کوئی شکیل بدایونی کیسے ملتا؟۔ اُن کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں اتر پردیش کے مردم خیز شہر بدایوں کے ایک مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ اُن کے والد امام مسجد تھے مگر تایا مولانا ضیا القادری ایک مشہور نعت گو تھے۔ علی گڑھ سے بی اے کیا۔ وہیں راز مُرادآبادی کی وساطت سے جگر مُرادآبادی تک رسائی ہوئی اور پھر محبتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ جگر ہر جگہ انہیں ساتھ لے کر مشاعرے میں جاتے۔ اللہ کریم نے خوش آواز پیدا کیا تھا، اچھا شعر عمدہ لحن کے ساتھ پڑھتے تو خوب داد سمیٹتے۔

۱۹۴۶ء میں ایک بار مشاعرے کے لیے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں مشہور ہدایت

کاروفلم ساز اے آر کاردار نے انہیں سنا تو انہیں اپنی فلموں میں گیت نگاری کی پیش کش کی۔ یوں اُن پر فلم نگری کے دراوازے کھل گئے۔ ڈائریکٹریٹ جنرل سپلائی اینڈ ڈیویلپمنٹ میں ملازم ہو چکے تھے مگر ملازمت ترک کر کے فلمی دنیا سے منسلک ہو گئے۔ سب سے پہلے ''درد'' فلم کے گیت لکھے۔ بعدازاں ایک سے ایک بہترین فلم جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے سب کے لیے نغمہ نگاری کی۔ دل لگی، دیوانی، دلاری، مدرانڈیا، سن آف انڈیا، اڑن کھٹولا، بابل، کوہ نور، جادو، گنگا جمنا، بیجو باورا، مغل اعظم، لیڈر، سنگھرش، شباب، شیام، سوہنی مہیوال، میلہ، میرے محبوب صاحب بی بی اور غلام، چودھویں کا چاند الغرض کس کس کامیاب فلم کے لیے گیت نہیں لکھے۔ اُن کے لکھے ہوئے گیت زیادہ تر محمد رفیع، لتا، شمشاد، طلعت محمود، مکیش، ثریا اور اوما دیوی نے گائے۔ کہا جاتا ہے کہ مغل اعظم کا وہ گیت جسے دربار میں گانے پر اکبر نے انارکلی کی جرات و گستاخی قرار دیا اور وہ برصغیر کے گلی کوچوں میں گایا گیا۔ نوک پلک سنوارنے کے لیے شکیل نے ۱۷ا مرتبہ تحریر کیا تھا۔ اُن کے ۵ مجموعہ ہائے کلام رعنائیاں، صنم وحرم، شبستان، رنگینیاں اور زیبائیاں کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔

شکیل بدایونی کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ دبستانِ فلم کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے فلموں میں نعتیں شامل کیں۔ ''مغلِ اعظم'' میں شامل اُن کی نعت محسنِ انسانیت کے حضور فریاد بھی ہے التجا بھی ہے، شاعر کے دل کی آواز بھی ہے جسے وہ آپ ﷺ کے حضور پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ ایک فرد ایک شاعر کے الفاظ سہی مگر اِن میں ہر دکھی مسلمان جس کی زندگی کا سفینہ مسائل کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے، اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ لہذا اپنے آقا ﷺ سے ملتمس ہے کہ اِس طرف کرم کی نظر فرمایئے تا کہ مصیبت کی گھٹائیں چھٹ جائیں، میرے بے قرار دل کو سکون و اطمینان نصیب ہو۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر کے دل میں جو اضطراب تھا اُس نے اسی کا اظہار کیا ہے۔

بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ
گردش میں ہے تقدیر بھنور میں ہے سفینہ

ہے وقتِ مدد آیئے بگڑی کو بنانے
پوشیدہ نہیں آپ سے کچھ دل کے فسانے
زخموں سے بھرا ہے کسی مجبور کا سینہ
بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ
چھائی ہے مصیبت کی گھٹا گیسوؤں والے
للہ مری ڈوبتی کشتی کو بچا لے
طوفان کے آثار ہیں دشوار ہے جینا
بے کس پہ کرم کیجیے سرکار مدینہ

کوئی میں آہ کھینچوں درد سے لب ریز ہو شاہا
ترے پیارے مدینے کے درو دیوار تک پہنچے
(اکرم کُنجاہی)

صوفی تبسم کا حسنِ کلام

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم پنجابی، اُردو اور فارسی تینوں زبانوں کے بہترین شاعر اور عالم تھے۔ اُنہوں نے صرف چند ایک فلموں کے لیے گیت لکھے جو زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر سکے البتہ فلم سازوں نے اُن کی غزلیں اور نظمیں کئی فلموں میں شامل کیں جو مقبول ہوئیں مثلاً ایک غزل ''سو بار چمن مہکا سو با بہار آئی''

فلم ''شام ڈھلے'' میں شامل ہوئی جسے نسیم بیگم نے گایا تھا۔ اُن کی ایک نظم فلم ''ایک تھی لڑکی'' میں بھی شامل کی گئی۔ وہ دراصل اِس شعبے کے آدمی ہی نہیں تھے۔ تقسیمِ ہند کے وقت جس

طرح ہندوستان کے کئی علاقوں سے اُردو اہلِ زبان کراچی منتقل ہوئے اسی طرح مشرقی پنجاب سے بھی بے شمار شاعر اور ادیب پاکستانی پنجاب خاص طور پر لاہور میں آ کر آباد ہوئے۔

صوفی تبسم ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ابتدا میں اصغر تخلص کرتے تھے۔ بعد میں تبسم کو تخلص کے طور پر اپنایا۔درویش منش انسان تھے اس لیے سابقہ صوفی اُن کے نام کا حصہ بن گیا۔فارسی میں شعر گوئی کی تو اہلِ ایران نے بھی اُن کی تعریف کی اور ''نشانِ فضیلت'' عطا کیا۔ ۱۹۳۰ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔تحریکِ آزادی کے لیے خوب صورت نظمیں لکھیں جو روز نامہ انقلاب اور زمیندار میں اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔

محکمہ تعلیم سے سبک دوشی کے بعد ماہنامہ ''لیل ونہار'' سے منسلک ہو گئے۔اُس کے بند ہونے کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اُن کے پنجابی زبان میں لکھے ہوئے قومی گیت اور ترانے جنہیں نور جہاں نے گایا تھا بے حد مقبول ہوئے:

میریا ڈھول سپاہیا
اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے
میرا سوہنا شہر قصورنی
میرا ماہی چھیل چھبیلا، کرنیل نی جرنیل نی

صوفی تبسم نے اُردو میں نغمات بھی لکھے۔اُن کا گیت ''وطن کے سپاہی'' (تینوں مسلح افواج کے لیے) ملاحظہ کیجیے:

یہ ہواؤں کے مسافر یہ سمندروں کے راہی
میرے سر بکف مجاہد میرے صف شکن سپاہی
یہ ہواؤں ----------
یہ تیرا یقینِ محکم تیری ہمتوں کی جاں ہے

تیرے بازوؤں کی طاقت تیرے عزم کا نشاں ہے
تو ہی راہ تو ہی منزل تو ہی میرِ کارواں ہے
یہ زمیں تیری زمیں ہے
یہ جہاں تیرا جہاں ہے
تیرے پاؤں میں ہے قوت
تیرے ہاتھ میں ہے شاہی
یہ ہواؤں کے مسافر یہ سمندروں کے راہی
میرے سر بکف مجاہد میرے صف شکن سپاہی
یہ ہواؤں ---------
تیرے ابروؤں کی جنبش تیری آنکھ کا شارہ
تیرے دشمنوں کی آفت تیرے قہر کا شرارہ
تو وطن کی آبرو ہے تو وطن کا ہے سہارا
اسی آبرو سے چمکا تیرے دیس کا ستارہ
تیرا دیس دے رہا ہے
تیری شان کی گواہی
یہ ہواؤں کے مسافر یہ سمندروں کے راہی
میرے سر بکف مجاہد میرے صف شکن سپاہی
یہ ہواؤں ---------

یہ نغمہ بھی بہت مقبول ہوا۔سلیم اقبال کی موسیقی میں ریڈیو پاکستان سے یہ گیت نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا گلوکارہ اقبال بانو نے بھی جنگ ستمبر میں اپنا حصہ ڈالا۔استاد نتھو خان کی موسیقی میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا نغمہ بہت پسند کیا گیا:

''اے جوانانِ وطن اے جوانانِ وطن،
تم سے ہی ہر لحظہ خنداں ہیں گلستانِ وطن''

ادبِ اطفال، تفہیمِ غالب اور اقبال کے لیے بھی آپ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے مجموعہ ہائے کلام انجمن، دامنِ دل، سراشکِ تبسم، نظراں کر دیاں گلاں، اور جھولے کے نام سے شائع ہوئے۔ سفر ایران میں اُن کا بہت سا کلام بیاضیں کھو جانے سے ضائع ہو گیا۔ ۷۸ برس کی عمر پائی اور لاہور میں انتقال ہوا۔

صوفی تبسم ایک بڑے عالم شخص تھے۔ اُنہوں نے جو لکھا بڑی ادبی چاشنی اور شعری جمالیات کا خیال رکھتے ہوئے لکھا۔ اُن کی وہ نعتیں جن میں پیارے نبی ﷺ کے مقام و مرتبے پر بات کی گئی ہے، اُن میں کمال درجے کی روانی، فصاحت اور زورِ بیاں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر قاری کو ایک سیلِ رواں میں بہائے چلا جا رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ یہ اُن کے اسلوبِ بیاں کی اثر آفرینی بھی ہے اور عشقِ رسول ﷺ کی عطا بھی۔ اُنہوں نے دراصل اِس بات کی بھی نعتیہ کلام میں وضاحت کی ہے کہ ہمارے دینی ایمان اور یقین کا سبب آپؐ ہی کی ہستی ہے جس نے ہمیں اللہ کی ذات سے متعارف کروایا ہمیں اُس ہستی کی عبادت کا سلیقہ عطا کیا۔

ہمارا ایمان اُس وقت تک مکمل اور کامل نہیں ہوتا جب تک ہم حضور کو کائنات کی ہر شے سے زیادہ افضل و اعلیٰ اور عزیز ترین نہ سمجھیں۔ ہمارے ایمان کا مقدر آپؐ کی ذات سے چمکا۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے اور خوب صورت شعری ترکیبوں کی داد بھی دیجیے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترکیبیں اسی نعتیہ کلام کے لیے اُتری ہیں:

رخشندہ ترے حسن سے رخسارِ یقیں ہے
تابندہ ترے عشق سے ایماں کی جبیں ہے
چمکا ہے تری ذات سے ایماں کا مقدر
تو خاتمِ کونین کا رخشندہ نگیں ہے

آپؐ کے مقام اور مرتبے کا اندازہ صرف خدا ہی کی ہستی کر سکتی ہے۔ ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ بشر ہی نہیں فخرِ بشر بھی ہیں۔ آپ خدا سے جدا ہیں مگر نورِ خدا اور حبیبِ خدا بھی ہیں۔ آپؐ قران کا عمل مظہر اور مرکزِ تجلیات بھی ہیں۔ آپؐ کائناتِ حسن بھی ہیں اور حسنِ کائنات بھی۔ آپ روحِ تمنا بھی ہیں اور مقصودِ عالم بھی۔ آپ وہ چراغِ ہدایت ہیں کہ ہر زمانے میں انسان آپؐ سے راہنمائی پاتا رہے گا۔

ریاض حسین زیدی اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔ آپؐ اقلیمِ ہست و بود کے سلطان بھی ہیں اور کون ومکاں کے مرکزی انسان بھی۔ لہذا ایک نعت نگار تو یہی کہے گا کہ میرے لفظ آپ کے تصور سے فروزاں ہیں۔ میری عبارتیں آپ کی کرم نوازیوں سے شاداں ہیں۔ میرا حسنِ تکلم اور حسنِ کلام آپ ہی کے ذکر کا احسان مند ہے۔ صوفی صاحب کے قلم نے بھی عشق ومحبت کی سیاہی میں ڈوب کر آپ کے مقام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپؐ آدمیت کا وقار اور عظمتِ انساں کا باعث ہیں کہ اللہ نے آپؐ کو عرش پر مہمان بنایا۔ یوں ثابت ہوا کہ کہکشائیں بھی آپؐ کے قدموں کی دھول ہیں اور جنت آپؐ کی راستے کا ایک نشان ہے۔

انسانیت آپؐ پر نازاں ہے کہ آپؐ ہی سے اُس کی عظمتوں کا ستارہ چمکا اور سرورِ کونین کا لقب آپؐ ہی کو زیبا ہے ۔شاعر نے آپؐ کے روئے انور اور خوئے اطہر کی صفات کے پُر اثر اسلوب میں بیان کیا ہے۔ آپؐ کی بعثت دنیا میں ہمہ گیر انقلاب کا سبب تھی۔

مورخ خوب جانتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا اور سرزمینِ حجاز کی حالت کیا تھی۔ اخلاقیات کا معیار کیا تھا۔ بیٹیوں سے لے کر غلاموں تک، سب کس کرب میں مبتلا تھے۔ رنگ، نسل اور قبائل کی تقسیم نے شرفِ انسانی کو کیا چرکے لگا رکھے تھے۔ خدائےﷺ واحد و یکتا کا کوئی تصور نہیں تھا۔ دنیا کفر وشرک میں مبتلا ہو کر انسانیت کی معراج سے اِس قدر گر چکی تھی کہ اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے لکڑی اور پتھر کے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

حضورؐ تشریف لائے اور انسان کو انسانیت کا درس دیا۔ انہیں اخلاق آشنا کیا۔ رنگ و

نسل کے بت ریزہ ریزہ کر دیئے۔ باطل کے اندھیرے چھٹ گئے اور صدق وسچائی کے اجالے آدمیت کا مقدر بن گئے۔ وہ سرزمین جو رذالت اور ضلالت میں مبتلا تھی۔ آپؐ کے مقدس قدم پڑتے ہی، انسان ذرّوں سے چاند ستاروں میں بدل گئے۔ یہ تھا انقلابِ محمدیﷺ:

وہ جس کے روئے انور میں جمالِ سرمدی پنہاں
وہ جس کے خوئے اطہر میں جلال ایزدی پیدا
غرورِ خسروی جس کے وقارِ عزم سے لرزاں
حصارِ کفر جس کے زورِ ایماں سے تہ و بالا
جہانِ خاک نے جس سے فلک کی بر تری پائی
وہ جس کے دم قدم سے اور ابھرا عالم ِ بالا
وقارِ عظمتِ انساں ہوا عیاں تجھ سے
جہانِ خاک سے ابھرا ہے آسماں تجھ سے
لقب ہے سرورِ کونین کا تجھے زیبا
کہ اپنے بخت پہ نازاں ہیں دو جہاں تجھ سے
چمکی تھی کبھی جو ترے نقشِ کفِ پا سے
اب تک وہ زمیں چاند ستاروں کی زمیں ہے

ایک مومن کی زندگی کا تقاضا ہے کہ وہ پیارے رسولﷺ کی سنت اور حدیث کی تابع فرمان ہو۔ مومن اُن کے ذکر سے اپنی زندگی کی محافل کو دلکش اور حسین بنا تا رہے۔ صوفی تبسم کا کہنا ہے کہ عشقِ رسولؐ کے تقاضے تو ہزار ہیں مگر زبان وقلم میں یہ تاب کہاں کہ آپؐ کی ثنا خوانی کا حق ادا کر سکے کہ آپؐ کے علم کی تفسیر ربِ کریم نے بیان کی ہے۔

آپ کی اوج ''سبحان الذی اسریٰ''۔ آپ کے ہاتھ ہی کی جنبش یدِ بیضا کی حیثیت رکھتی تھی۔

جس میں ہو ترا ذکر وہی بزم ہے رنگیں
جس میں ہو ترا نام وہی بات حسیں ہے
ثنا خواں کس طرح ہو کوئی اُس محبوبِ یکتا کا
زباں میں یہ کہاں قدرت ، قلم کو یہ کہاں یارا
وہ جس کے علم کی تفسیر، الم نشرح لک صدرک
وہ جس کی اوج کی تعبیر ، سبحان الذی اسریٰ
وہ جس کے ہاتھ کی جنبش میں صد ضربِ کلیمی تھی
وہ جس کی آستیں میں تھے نہاں لاکھوں یدِ بیضا

آپ کی ہستی کو یاد کرنا، اُن کا ذکر کرنا یا اُن کی یاد میں آنسو بہانا سب عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کی محبت کے بغیر ایک مومن کی زندگی کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ وہ دین و دنیا کے کسی معاملے میں آپؐ کے تصور کے بغیر کوئی لذت نہیں پاتا۔ نامِ محمد کی حلاوت نہ ہو تو وہ آبِ حیات کے پیالے کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔

یہ حبِ رسولؐ کا تقاضا ہے کہ اپنی زندگی اُن کی سند کے سانچے میں ڈھال لی جائے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے کہ ہم اُن کے ارشادات کے یاد رکھیں، اُن کا ذکر صبح وشام کرتے رہیں۔ عشاق صادق کی جان تو آپؐ کی یاد میں جانِ حزیں بن جاتی ہے۔ عشاق خاموش ہوں یا کلام کریں ہر دو صورتوں میں آقاؐ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ انہیں ایک پل قرار نہیں آتا اور وہ چاہتے ہیں کہ اڑ کر آپؐ کے دربار عالی میں پہنچ جائیں۔ احسان دانش نے تو ایک کمال انداز کی مختلف بات کہی:

ہو جائیں راہ میں نہ کہیں ختم اشکِ غم
دولت یہ اُنؐ کے در پہ پہنچ کر لٹائی جائے

صوفی تبسم بھی ہر پل آپؐ کی احادیث سننے اور آپؐ کے پیار کے گیت لکھنے کی آرزو

کرتے ہیں۔ وہ آپ ہی کے قطرۂ ابرِ کرم سیدل کے صدف کو موتی کرنا چاہتے ہیں کہ بادِ صبا اور بادِ خزاں سے بالکل بے نیاز آپؐ کے ہی ذکر سے نخلِ دل ہمیشہ شاداب رہتا ہے۔ اُن کی نظر میں نوعِ انساں کا شرف اور معراج یہ ہے کہ وہ خود کو حضورﷺ کے در کا گدا بنانا چاہتے ہیں۔ سردارِ کونین کی یاد میں ٹپکا ہوا آنسو حسنِ مقدر کا ستارہ ہے:

وہ اک آنسو جو اُن کی یاد میں آنکھوں سے ٹپکا ہے
وہی آنسو ستارہ ہے مرے حسنِ مقدر کا
تبسم مجھ سے عاصی کا یہی بس اک سہارا ہے
کہ میں ادنیٰ گدا ہوں سرورِ کونینﷺ کے در کا

اُن کے نعتیہ کلام کا مطالعہ ایک اور بات واضح کر دیتا ہے کہ اُن کی فکر میں تسلسل اور روانی ہے۔ اُن کی نعوت اگر چہ غزل کی ہئیت میں ہیں مگر اُن میں فکر کا بہاؤ نظم کا سا لطف پیدا کر رہا ہے۔ وہ ایک ہی فکر کی عکاس یا غزلِ مسلسل کی طرح ایک ہی فضا میں ہیں۔

وہ آپؐ کا مقام بیان کر رہے ہیں تو اُسی خیال اور اُس کے تلازمات کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ آپؐ کے اخلاق بیان کر رہے ہیں تو خلقِ عظیم ہی کی بات کر رہے ہیں اور اگر حضورؐ کی سراپا نگاری کرتے ہیں تو اُس فکر سے باہر نہیں نکلتے۔ اِس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی طرح اُن کا ذہن کس قدر زرخیز تھا اور لفظیات کا کتنا خزانہ اُن کے پاس تھا۔

وہ جس کے فقر کے آگے نگوں سر تھی شہنشاہی
وہ جس کے بوریا پر سر جھکا، فغفور و قیصر کا
یہ حسنِ خلق، یہ لطفِ نظر، یہ عفو، یہ بخشش
خراماں جس طرح کیفِ رواں تسنیم و کوثر کا
وہ جس کی ذات تھی خود احسن التقویم کی غایت
وہ جس کا حسن ہی خود آئنہ تھا حسن داور کا

ہر قول ترا، حرفِ صداقت کا ہے ضامن
ہر فعل ترا ، حسنِ ارادت کا امیں ہے
آنکھوں میں ہے اُس خلقِ مجسم کا تصور
اک خلدِ مسرت ، مری نظروں کے قریں ہے

آقاؐ ترے دیار کے ذرّوں سا بھی نہیں
گجرات سے گو حسن ہے ہر سولہور تک
(اکرم کُنجاہی)

صہبا اختر کا مدینۂ نعت

صہبا اختر ایک بہترین نظم نگار تھے۔طویل نظمیں لکھنے میں انہیں دستِ کمال حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی نظم کا سلسلہ ایک طرف نظیر اور دوسری طرف جوش سے ملتا تھا۔اُن کا شعر خوانی کا انداز بڑا پُر جوش ہوا کرتا تھا۔اُن کی نظمیں قدرے طویل ہوا کرتی تھیں مگر اُن میں تندی و تیزی، زورِ بیاں، روانی اور ولولہ، قاری اور سامع کو گرفت میں لیے رکھتا تھا۔اُن کے والد ایک تھیٹر کمپنی سے منسلک تھے۔آغا حشر کاشمیری کے ہم عصر تھے۔ اِس لیے اُن کا قیام بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر رہا۔

اختر علی (صہبا اختر) ۱۹۳۰ء میں جموں (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔بچپن بریلی میں گزرا۔میٹرک وہاں سے کیا۔مزید تعلیم کے لیے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔تقسیمِ ہند کے بعد کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ پہلے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے۔ پھر راشننگ کے شعبے میں ملازم ہوئے۔۱۹۸۷ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

۱۹۶۰ء میں ریڈیو کے لیے گیت لکھنا شروع کیے۔ اُن کا قومی گیت

''یارب مرے وطن کا پرچم بلند رکھنا''
اپنے کرم کا یونہی احسان مند رکھنا
سایہ پڑے نہ کوئی اِس کی تجلیوں پر
نازاں رہیں ستارے، اِس کی بلندیوں پر

بہت مقبول ہوا۔ ایک فلم ''آزادی یا موت''، مکمل طور پر کراچی میں بنی تھی جس کے نغمہ نگار صہبا اختر تھے۔ اِس فلم میں پہلی بار موسیقار لعل محمد اقبال نے ایک قومی نغمہ مشہور پنجابی لوک فنکار عالم لوہار کی آواز میں ریکارڈ کیا۔ یہ صہبا اختر کا لکھا ہوا تھا اور ایک زمانے میں اکثر اوقات قومی تہواروں پر سنائی دیتا: ''او دنیا جانے میرے وطن کی شان''

ایک اور گیت جو ماضی کی مقبول گلوکارہ نگہت سیما کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا اور اکثر فوجی بھائیوں کے ریڈیو پروگرام میں سنا جاتا وہ بھی صہبا اکثر کا لکھا ہوا تھا:

''میرا چن ماہی کپتان''

ان کا لکھا ہوا ایک ملی گیت نہ صرف اپنے وقت کا سپر ہٹ نغمہ تھا بلکہ آج بھی ناممکن ہے کہ 14 اگست کے موقع پر کوئی اسے بھول جائے:

میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے

اسے 1982ء میں سہیل رعنا کی موسیقی میں محمد علی شہکی نے گایا۔ صہبا اختر بے حد سادا انسان تھے۔ پاکستان ٹیلی وژن کراچی مرکز کے لئے موسیقار کریم شہاب الدین کی دھنوں پر صہبا صاحب سے گیت لکھوانے تھے۔

کریم اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ لانڈھی میں صہبا صاحب کے سرکاری مکان میں گئے۔ وہ کہنے لگے آؤ میاں باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ کریم صاحب نے جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی۔ اس پر ردھم بجا کر 'ڈمی بول' اور 'لا را۔ لا را' کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر صہبا صاحب

خاموش رہے پھر کاغذ پر پنسل دوڑنے لگی اور گیت تیار۔

وہ سچے، کھرے اور محبِ وطن شاعر تھے۔ اُن کی شاعری کی اساس وطن سے محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں شاعرِ پاکستان بھی کہا جاتا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ٹی وی اسٹیشن قائم ہوا تو انہوں نے بھی اسے چار چاند لگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ موسیقار لعل محمد اقبال سے اُن کے مراسم ریڈیو کے زمانے سے تھے۔ جب اُنہوں نے فلموں کے لیے موسیقی دینا شروع کی تو صہبا اختر کے لیے بھی فلمی دنیا کا راستہ ہموار ہو گیا۔

۱۹۶۳ء میں بننے والی فلم پروفیسر کا ایک گیت ''جنم جنم تیرا میرا ساتھ رہے گا''

جسے رونا لیلیٰ نے گایا تھا اُن کا پہلا مقبول گیت ثابت ہوا۔ صہبا اختر نے بھی فلم نگری کے لیے بہت زیادہ نہیں لکھا مگر جو لکھا وہ قبولِ عام کی سند پا گیا۔ کئی ایک فلمیں جو ناکام رہیں، اُن فلموں کے لیے بھی صہبا کے لکھے گیت مشہور ہوئے۔ صہبا نے تقریباً دس برسوں میں آزادی یا موت، پروفیسر، جیمز بانڈ ۸۰۰، بادل اور بجلی، سمندر، احسان، جھک گیا آسمان، جلتے ارمان بجھتے دیپ وغیرہ کے لیے نغمات لکھے جو رونا لیلی، احمد رشدی، مہدی حسن، نور جہاں، مالا، نگہت سیما، وغیرہ نے گائے۔ ''صہبا اختر کا نعتیہ مجموعہ ''اقرا'' اپنے اسلوبِ بیان کے اعتبار سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔

ویسے بھی شکوہِ الفاظ، بلند آہنگی اور رفعتِ خیال اُن کے کلام کا خاصہ تھا۔ اُن کی قومی و ملی منظومات میں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے تڑپ محسوس ہوتی تھی۔ جلال و جمال سے بھرپور نظموں میں فتح وظفر مندی کی آرزو نمایاں ہوا کرتی تھی۔

طفیل ہوشیار پوری اور کلیم عثمانی کے طرح صہبا اختر نے اچھے قومی و ملی گیت بھی لکھے اور خوب صورت نعت نگاری بھی کی۔ اُن کی پہلی شعری تخلیق ''سرکشیدہ'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات اور دوہے شامل تھے، اُسے آدم جی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

بعدازاں ۱۹۸۴ء میں ''سمندر'' جس میں نظمیں شامل تھیں اور ۱۹۹۵ء میں اُن کی وفات سے ایک سال پہلے مجموعہ کلام ''مشعل'' جو زیادہ تر قومی و ملی نظموں اور مثنوی پر مشتمل تھا شائع ہوا۔

محقق زیب النسا زیبی نے اُن کے کچھ غیر مطبوعہ مجموعہ ہائے کلام کا ذکر بھی کیا ہے جس میں ہنر (غزلیات)، ارژنگ (رباعیات)، جلترنگ (دوہے)، ایقان (حمد و نعت)، عقیدت سلام، قصائد، مثنوی، مرثیہ)، خراج (شخصی نظمیں)، دعا در دعا (قرانی دعاؤں کا منظوم ترجمہ)، قطعات اور تلچھٹ'' (مختلف اخبارات میں گم کلام کا انتخاب)، خزینہ (کلیاتِ غزل) اور سر گزشتِ صہبا (سوانح عمری)۔ وہ روزنامہ ''حریت'' میں ہر ہفتے ایک نظم اور روزنامہ مشرق میں روزانہ قطعہ لکھا کرتے تھے۔

مختلف اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی۔ دوہے بھی لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے تقریباً ساٹھ ہزار اشعار کہے۔ اِس اعتبار سے اُن کے مجموعہ ہائے کلام تعداد میں بہت کم ہیں۔ وہ کراچی میں ۷۶ برس کی عمر میں ۱۹۹۶ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

صہبا اختر کا ۲۵۶ صفحات پر مشتمل مجموعۂ نعت ''اقرا'' کئی اعتبار سے دل چسپ اور اہم ہے۔ جس میں ۲ حمد یں، ۱۴۳ نعتیں جن میں غزلیہ ہئیت کے علاوہ نعتیہ نظمیں اور آزاد نعتیہ نظمیں بھی شامل ہیں، ۴ نعتیہ رباعیات، ۲ نعتیہ قطعات اور ایک منقبت شامل ہے۔ اقرا پر تعارفی و توصیفی مضامین لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، انجم اعظمی اور راجہ رشید محمود شامل ہیں۔

اُن کی ۱۴۳ نعوت میں سے ۵۵ غزل کی ہئیت میں ہیں۔ معروف شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور محقق منظر عارفی نے اپنی تحقیقی کتاب ''کراچی کا دبستانِ نعت'' میں صہبا اختر کی خودستائی، خودنمائی اور خود پرستی پر خاصی منفی تنقید کی ہے اور یہاں تک کہا ہے کہ اُن کی غزلیہ نعوت میں نعت کا رکنِ اعظم یعنی ''ثنائے مصطفےٰ ﷺ'' پانچ چھ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ اِس لیے اُنہوں نے صہبا کی نعتیہ نظموں ''وہی اول وہی آخر''، ''انسانِ کامل'' اور ''احسانات محمدی'' ہی کو قابلِ اعتنا

سمجھا ہے اور اپنی تحقیق میں آخرالذکر سے انتخاب پیش کیا ہے۔

مجھے کسی حد تک اِس بات سے اتفاق ہے اِس لیے کہ نظمیہ نعتوں میں جہاں اُنہوں نے مناظر فطرت اور قران کے اثرات و کمالات کا ذکر کر کے حضور ﷺ کے حسن و جمال یا اخلاقِ حسنہ اجاگر کیے ہیں اور سید البشر کی ثنا بیان کی ہے وہاں اُنہوں نے غزلیہ ہئیت میں ''واحد متکلم'' کا صیغہ استعمال کر کے بے جا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ محلِ نظر محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے کی مترادف ہے۔ بڑے بڑے شعرا ٹھوکر کھا جاتے ہیں، اِس سے دامن بچایا جاتا تو بہتر تھا۔

غزلیہ ہئیت میں اُن کی ایک نعت کی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نعت کی بزمِ ادب میں آج صہبا میں بھی ہوں
دست بستہ لفظ بھی ہیں ، دست بستہ میں بھی ہوں
ایک بے سایہ کا سایہ ساتھ رہتا ہے سدا
ورنہ اپنی ذات کے صحرا میں تنہا میں بھی ہوں
گونجتے رہتے ہیں قلب و جاں میں اسمائے رسول ﷺ
صرف قراں ہی نہیں ، مدح سراپا ، میں بھی ہوں
نعت کی محفل میں یاں حد سے تجاوز ہے محال
ورنہ اہلِ ظرف واقف ہیں کہ دریا میں بھی ہوں
جب سخن کی داد ملتی ہے سکوتِ عرش سے
تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں بھی ہوں

اب آیئے ذرا اِن اشعار کا فکری حوالے سے تجزیہ کرتے ہیں۔ پہلا شعر بے شک داد کا متقاضی ہے کہ شاعر عجزِ بیاں سے کام لے رہا ہے کہ انکسار اور کم مائیگی کا اظہار تقدیسی ادب کی شرط اولیں ہے۔ کہتے ہیں آج نعت گوئی کی محفل میں بڑے ادب کے ساتھ دربارِ رسالت ﷺ میں

الفاظ بھی ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور میں بھی نظریں نیچی کیے سرنگوں ہاتھ باندھے ہوئے اپنی نعت کا نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں کہ شرفِ قبولیت عطا ہو۔

دوسرے شعر کا پہلا مصرع خوب ہے نبی پاک ﷺ کا سایہ نہیں تھا۔نعت گو کہتا ہے مگر دنیا کی پریشانیوں اور دکھوں کی جھمیلوں میں اُن کا سایہ یعنی اُنؐ کی کرم فرمائی میرے ساتھ رہتی ہے۔یہاں تک بات درست اور خوب صورت ہے مگر پھر نبیٔ آخرالزماں کی یکتائی اور انفرادیت (کہ آپ ؐ کا سایہ نہیں تھا جسے شاعر تنہائی کا نام دے رہا ہے) کو اپنی تنہائی کے ساتھ ملا رہے ہیں۔یہ غور وفکر کا مقام ہے۔جس خاک نے پیارے نبیؐ کے کف پا کے بوسے لیے، وہ بھی ہم سے افضل و برتر ہے۔ ہماری آنکھ کا سرمہ ہے۔کجا یہ کہ نبی ﷺ کی انفردیت سے اپنی تنہائی کا موازنہ کیا جائے۔نعت نگاری میں افراط وتفریط سے دامن بچانا انتہائی ضروری ہے۔

تیسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں ایک محبّ صادق کی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے کہ وہ اسمائے رسول ﷺ کا ہر دم ورد کرتا رہتا ہے۔گویا ہر ہر پل محبوب کے تصور ہی میں مگن رہتا ہے۔عشق ومحبت کی انتہائی منزل پر عشاق کا یہی چلن ہوتا ہے مگر اسی شعر کے مصرع ثانی میں پھر صہبا اختر نے ایٹمی دھماکہ کر دیا ہے۔لکھتے ہیں ساقیٔ کوثر کا دل و جان سے ثنا خواں قران ہی نہیں میں بھی ہوں۔

صہبا نے یہ نعتیہ شعر کہنے کے بعد اِس کی معنویت پر لگتا ہے چنداں غور نہیں کیا۔تقدیسی ادب میں لاشعور اور وجدان ہی نہیں شعور وادراک بھی بے حد اہم ہوتا ہے۔کوئی عام سا مسلمان بھی اِس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ اپنی لفظیات اور اپنی فکر کو الہامی کتب کے مقابلے پہ رکھ دے کہ وہ اللہ کریم کے سچے اور کھرے الفاظ ہیں جو وحی کی صورت میں انبیا کرامؑ پر حضرت جبریلؑ کی وساطت سے نازل ہوئے۔اُن کے مقابل ہم بے مایہ اور بے حیثیت شعرا کے الفاظ کیا معانی رکھتے ہیں؟۔احتیاط بہت احتیاط۔

چوتھے شعر میں خود کہہ رہے ہیں کہ بزمِ نعت میں حد سے تجاوز روا نہیں۔حیرت ہے کہ

انہیں اِس بات کا احساس ہے مگر پھر بھی مصرع ثانی میں کہہ رہے ہیں کہ ’’دریا میں بھی ہوں‘‘۔ اُس دربار میں تو سمندر کی حیثیت بھی ایک قطرے سے ایک خورشیدِ جہاں تاب ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں۔ کم مائیگی ہی کم مائیگی ہے۔ ہر شخص اُس دربار میں جھولی پھیلاتا ہے کہ کچھ عطا ہو جائے کوئی کرم گستری ہو جائے۔ پانچویں (آخری شعر) متاثر کر رہا ہے۔

نبی پیارے کی نعت ہر انسان کے لیے باعث برکت و سعادت ہے۔ توشۂ آخرت ہے۔ شاعر کا یہ کہنا کہ جب مجھے عرش والے سے رسولؐ کی مدحت پر شاباش ملتی ہے تو اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ بے شک اللہ کریم خود سب سے پہلا ناعت ہے۔ خود وہ ہستی اور اُس کے فرشتے رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور ہمیں بھی یہی حکم ہے۔

لہٰذا جب شعرا نعت نگاری کرتے ہیں تو خالقِ دو جہاں کی ذات اِس عمل پر خوش ہوتی ہے۔ مذکورہ نعت کے دو مزید اشعار کہ جن میں شاعر خود کو بدر واحد کے جاں نثاروں میں شمار کر رہا ہے اور کوثر و تسنیم کا حق دار قرار دے رہا ہے، وہ بھی توجہ چاہتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ردیف ’’میں بھی ہوں‘‘ کو نبھانے کے لیے نعتیہ مضامین میں فکری تصرف ہوا ہے۔ اگر صفحہ نمبر ۲۰۴/۲۰۵ پر شامل اِس نعت کو ’’اقرا‘‘ میں شامل نہ کیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ ایک اور نعت کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔ آپؐ کے دربار میں توشۂ آخرت پذیرائی کے لیے نہیں قبولیت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ مزید براں کسی بھی نوع کی خود ستائی سے بھی دامن کو داغ دار نہیں کرنا چاہیے:

میرے آقاؐ اب اسے شان ِپذیرائی بھی دے
تو نے ہی دیوان کی صورت مجھے اقرا دیا
ظہوری، جامی و قدسی، قآنی، سعدی و رومی
مری نعتوں کے قائل تھے، جہاں کل رات کو میں تھا

ایک اور مطلع جس میں الفاظ کا چناؤ پھر محلِ نظر ہے۔ ایک اچھے نعت گو کی بد نصیبی ہی کہی جا سکتی ہے کہ کہیں پذیرائی اور کہیں نمود و نمائش کا طلب گار ہے۔ غور فرمائیے:

مجھے گمنام مت رکھو مجھے بامِ نمائش دو
میں اُس کے گیت لایا ہوں مجھے میری ستائش دو

ایک لا جواب شعری مجموعے میں نظر ثانی مناسب نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بے احتیاطی ہوئی۔ دیباچے میں خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''میں جانتا ہوں کہ تمام اصنافِ سخن میں نعت ایک مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اِس کے لیے کمال تحمل، صبر اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں کیا کروں میرے دل میں ایک ایسا شعلہ جاگ چکا تھا جس نے مجھے صبر کی بجائے ایک عجیب اضطراب، عجلت، بے قراری اور بے صبری کے حوالے کر دیا تھا'' مجھے اِس بات کا اعتراف ہے کہ یہ عطا ہی عطا تھی کہ مقدس تخلیق کا شعلہ انہیں بے چین کیے ہوئے تھا مگر عجلت بھی ہوئی جس نے نعتیہ مجموعے کو فکری اعتبار سے متاثر کیا ہے مگر ایسے چند اشعار جن کا اوپر حوالا دیا گیا ہے ۲۵۸ صفحات کی کتاب کی دو سے تین غزلیہ ہئیت کی نعوت میں ہیں۔ اِس خوب صورت کلام کی دوبارہ اشاعت کرنے والا ادارہ انہیں خارج کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا غزلیہ نعت کے دیگر اشعار فکری اور اسلوبیاتی حوالے سے پُر اثر ہیں۔ یہ دو اشعار دیکھیں کہ نعت نگار جنت نہیں آپؐ کے کرم آپؐ کی نوازش کا طلب گار ہے۔ وہ ستاروں سے مخاطب ہو کر ایک جمالیاتی خواہش کا اظہار کر رہا ہے کہ لغت میں اجرامِ فلکی سے متعلق جتنے روشن ورخشاں تلازمات ہیں وہ عطا کرو تا کہ میری نعت نور سے بھر جائے اور اِس قابل ہو جائے کہ پیارے نبی ﷺ کے حضور پیش کر سکوں۔

نعت گوئی اسی عجز و انکسار سے لو پاتی ہے اور اُن کے ہاں نعت کے اِس پہلو کی بھی کوئی کمی نہیں۔ وہ اِس فکر و فن کو آپ ہی کی عطا قرار دیتے ہیں۔ اپنی ایک رباعی میں لکھا کہ یہ دیوان تو مجھے آپؐ کے کرم نوازی نے بخشا ہے میں تو صرف اِس کا کاتب ہوں۔ وہ ہستی کہ جس کے قدموں کو مہ و نجوم چوم رہے ہیں، اُس کے فیضان کی یہ دولت ہے کہ کاملینِ فنِ شعر گوئی بھی انہیں فن کا سادات پکارتے ہیں لیکن وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ ثنا خوانِ رسولؐ کو آپ کی مدحت سے

کام رکھنا چاہیے، زمانے کی توصیف سے اُسے غرض نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ نعت نگار کے لیے وقعت نہیں رکھتی۔ وہ حضورؐ کے سامنے جھولی پھیلائے ہوئے استدعا کر رہے ہیں کہ آقاؐ میرے ہاتھوں میں ہُنر کا کشکول ہے، اِسے نعت کی خیرات سے بھر دے۔

مزید کہتے ہیں کہ وہ روشنی آپؐ ہی کی نوازشات کی بھیجی ہوئی ہے جس سے میری نعت کا مصرع مصرع ایسے چمک اٹھا جیسے وہ مصرع نہیں الہام کی کرن کرن اُتر رہی ہو۔ مجھے نعت گوئی کا منفرد اور جداگانہ سلیقہ دیا جس کی وجہ سے میرا دیوان اوروں سے مختلف ہے۔

آپ نے شعر گوئی کے نام پر مجھے خیالات وافکار کا ایک جہاں عطا کر دیا۔ میرے ہاتھ میں تو صرف کاسۂ تیرہ شبی تھا آپ نے شعور کی صورت مجھے سورج جیسا نور اور اجالا بخشا۔

فرشتو خواہشِ پروانۂ جنت نہیں لیکن
مجھے اُس کا کرم لا دو، مجھے اُس کی نوازش دو
ستارو جن سے میری نعت بھی پُر نور ہو جائے
مجھے فرہنگِ مہرو ماہ کے وہ حرفِ تابش دو

نعتیہ رباعی

جو اُس سے ملا اُس کی حفاظت کی ہے
جو اُس نے کہا اُس کی اطاعت کی ہے
دیوان کسی اور نے بخشا ہے مجھے
میں نے تو فقط اِس کی کتابت کی ہے
ملا ہے مدحتِ سرکارؐ سے وہ مرتبہ صہبا
کہ اہلِ فن، ہمیں منجملۂ سادات کہتے ہیں

ہمیں اپنی طرف سے کچھ اضافے کی کہاں جرات جو وہ ارشاد فرمائیں، وہ ارشادات لکھتے ہیں

ہم کو فقط رسولؐ کی مدحت سے کام ہے
توصیف پیشگیٔ زمانہ حرام ہے

اُن سے دو تین نعتوں میں کچھ فکری افراط وتفریط ہوئی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ صہبا اختر وہ نعت گو ہے جس نے وہ بے مثال نعت کہی تھی۔آفرین صد آفرین۔جذب وکیف، مکمل وارفتگی اورسپرگی، وجدانی کیفیت اور عشقِ رسول ﷺ میں فنا ہوئے بغیر یہ کیسے کہی جاسکتی ہے۔دس اشعار کی اس عظیم نعت کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

اندھیرے حرفِ باطل تھے، جہاں کل رات کو میں تھا
محمد ﷺ شمع محفل تھا، جہاں کل رات کو میں تھا
خزانے بٹ رہے تھے نور کے دربارِ عالی میں
مہ و خورشید سائل تھے، جہاں کل رات کو میں تھا
زمین و آسمان و ثابت و سیارہ و انجم
سبھی گردش سے غافل تھے، جہاں کل رات کو میں تھا
خطا پوشی و جاں بخشی، صلائے عام ٹھہری تھی
نہ منصف تھے نہ عادل تھے ، جہاں کل رات کو میں تھا
رسول و انبیا، جن و بشر، حور و ملائک کیا
سبھی کو بار حاصل تھے، جہاں کل رات کو میں تھا
مکمل ہو رہے تھے خود قصیدے سرورِ دیں کے
ادھورے حرف کامل تھے، جہاں کل رات کو میں تھا
فسونِ خواب پرور میں دلِ بیدار کو صہبا
مسلسل خواب حاصل تھے ، جہاں کل رات کو میں تھا

یہ بلا شبہ ایک خاص کیفیت کی نعت ہے۔یوں لگتا ہے کہ دیدۂ خوش خواب دربارِ رسول

ﷺ میں زیارت سے فیض یاب ہے۔ حاضری وحضوری کی کیفیت ہے۔ حضورﷺ خود میرِ مجلس تھے۔ جہاں آپؐ ہوں گے وہاں تاریکیوں کا کیا کام۔ وہاں تو اُجالے ہی اُجالے بٹ رہے تھے۔ عطا ہی عطا تھی۔ فیضان تھا، کرم گستری تھی۔

جب آپؐ کی ذاتِ گرامی شمع محفل کی طرح تھی تو عشاق دم بہ خود اور دیدار میں محو کیوں نہ ہوں گے۔ شاعر چوں کہ وہاں حاضر تھا اِس لیے اُس کا کہنا ہے کہ کائنات کے تمام سیارے، زمین اور آسمان سب اپنی گردشیں بھول کر دیدار میں کھوئے ہوئے تھے۔

عفو ودرگزر کی کیفیت اور رحم وکرم کا کیا کہنا کہ منصف وعادل کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہاں تو سزا کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ بس صلۂ رحمی تھا۔ خطا پوشی اور جان بخشی تھی۔ کیا جن وبشر، کیا حور وملائک، کیا رسول وانبیا ہر کسی کو اذنِ حضوری تھا سب کی دربارِ نبیؐ رسائی تھی۔

جو قصیدہ گو تھے اُن کی تخلیقات الفاظ اور فکر کی محتاج نہ تھیں۔ آپؐ کی موجودگی میں فکر وفن کی غذا کا خود اہتمام ہو رہا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ کیا خواب پرور سحر تھا کہ میں سنہری سپنوں کی آغوش میں تھا۔

اُن کی کئی ایک نعوت میں دعائیہ رنگ نمایاں ہے کہ جس میں اسی طرح شاعر درخواست گزار ہے کہ اُسے ہُنر کی دولت بخشی جائے تا کہ وہ اپنے نبیؐ کی خوب تر سے خوب ترین مدحت کر سکے۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں:

''ابتدا میں اِس کتاب کا بہ مشکل چوتھائی حصہ میرے پاس کلام کی صورت موجود تھا اور بس۔ پھر یوں ہوا کہ میں نے دعا کی۔ اے رب للعالمین! میری مدد فرما۔ ہاتھ میں قلم اور میز پر سادہ کاغذ رکھ کر میں نے عالمِ خیال میں دِرِ رسولﷺ پر صدا لگائی۔ سائے مدینۂ علم، اے رسولِ بر حقؐ مجھے خیال دے لفظ دے اظہار دے، بیان دے، وہ توفیق عطا فرما جو نعت سرائی کا سرور اور احساس وافکار کا نور بن سکے۔

بحمد للہ میری دعا مستجاب اور میری عاجزانہ صدا کامیاب ہوئی''۔

ایک نعت کا مطلع اور آخری شعر ملاحظہ کیجیے:

ہوائے نعت کا اک عمر سے میں بھی ہوں زنجیری
دلِ حسّان ؓ دے مولا مجھے یا فکر بوصیریؒ
مجھے مسند نشینِ نعت فرما دے مرے آقاؐ
کہ تو نے بے نواؤں کو بھی بخشی ہے جہانگیری

اپنی ایک دعائیہ حمدیہ ونعتیہ نظم ''اے مرے معبود'' میں بھی خالق حقیقی سے استدعا کر رہے ہیں کہ میرے مالک میں افکار اور معانی کے شہر میں سائل بن کر آیا ہوں۔

میرے ہاتھوں میں ایسا کشکول تھما دے کہ جس میں آسمانی بارشیں گھلی ہوئی ہوں۔ میرے آنسوؤں کے عوض شعور وآگہی کے چشموں سے مجھے گہر ہائے آب دار عطا کر۔

میں نعتِ مصطفےؐ لکھنا چاہتا ہوں مجھے اشعار کے حسن و جمال کے لیے چاندنی کے لفظ اور روشنی کے بول عطا کر اور اس آزاد نظم کے آخری دو مصارع میں کہتے ہیں:

مجھ پہ آفاقِ سخن کر منکشف
اور لطفِ بیکراں سے میرا سینہ کھول دے

اسی طرح اپنی حمدیہ ونعتیہ نظم ''دعائے نیم شب'' میں پہلے خالقِ ہر دوسرا کی توصیف بیان کرتے ہیں بعد ازاں دو جہان کے والی سے ملتمس ہیں کہ تیرا محبوب کو روشنی کا سفیر تھا۔ مجھے توفیق بخش دے کہ میں ایسی نعت لکھ سکوں کہ میرے مصارع کہکشاں کہکشاں بن جائیں اور نعت کے حوالے سے مثلِ بدرِ منیر میرا بھی نام چمکے۔

مذکورہ نظم کے بعد کتاب میں ''ایک اور دعا'' کے نام سے نظم ہے۔ اُس میں بھی حسنِ ترتیب یہی ہے کہ پہلے وہ بارگاہِ خالقِ کائنات میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں اور پھر درخواست گزار ہوتے ہیں کہ مولا میرے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے۔

میں سوالی ہوں۔ میری حوصلہ افزائی فرما۔ میں خفتہ بخت ملال نارسائی میں مبتلا ہوں۔

یہاں شاعر کا ملال نارسائی یہ ہے کہ وہ خود کو ابھی اس قابل نہیں پاتا کہ حضور کے شایانِ شان تعریف بیان کر سکے، اِس لیے عرضی پیش کر رہا ہے کہ اُسے نعتِ مصطفےؐ کا سرمایہ عطا ہو جائے۔ نعت نگاری کا سلیقہ آ جائے۔ مناسب فکر اور خوب صورت اسلوبِ بیاں مل جائے تا کہ وہ سرکارؐ کی مدحیت کا حق ادا کر سکے اور اُس کی قسمت کا ستارہ بھی روشن روشن ہو جائے۔

اِس نوعیت کی کافی حمدیہ و نعتیہ نظمیں ''اقرا'' میں شامل ہیں۔ چند اشعار سے صرف نظر کرتے ہوئے، بلاشبہ یہ کتاب ظاہر کرتی ہے کہ اُن کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔ اسی نوعیت کی ایک آزاد نعتیہ نظم ''التماس'' ملاحظہ کیجیے:

اے رسولِ کبریاؐ
آپؐ نے حسّانؓ سے
جب قصیدہ تھا سنا تو صلے کے طور پر
شاد ہو کر خدمتِ حسّانؓ سے
اک مبارک خسروانہ شان سے
انتہائی لطف سے احسان سے
آپؐ نے فرمائی تھی حسّانؓ کے حق میں دعا
اے خدا روح الامینؑ کو کر دے اُس کا ہم نوا
میں بھی حسّانی ہوں آقاؐ، مجھ کو بھی کوئی صلہ
میرے بھی حق میں دعا
اے رسولِ کبریاؐ
اے رسولِ کبریاؐ

اُن کا طرزِ بیاں منفرد ہے اور غزلیہ نعتوں میں بھی نظمیہ رنگ اور آہنگ پایا جاتا ہے۔ کئی اشعار میں راست بیانیہ نہیں ہے کلام میں تہہ داری ہے جس سے منظر عارفی صاحب نے یہ تاثر لیا

کہ کلام میں پانچ چھ فی صد نعتیہ اشعار ہیں۔

اگر اِس معاملے میں اُن کی بات مان لی جائے تو پھر صنفِ نعت میں فکری و اسلوبیاتی وسعت کیسے پیدا ہوگی۔ اِس کا دائرہ کار بہت محدود رہے گا۔ نعت کی سب سے اہم تعریف ہی یہی ہے کہ ہر وہ شعر جس میں حضورؐ کے سراپا مبارک سے لے کر اُن کے معجزات تک، اُن سے وابستہ مقامات سے لے کر اُن کے صحابہ تک، اُن کے حسنِ اخلاق سے لے کر اُن کے غزوات تک، اُن کی سنت سے لے کر اُن کی احادیث تک، اُن کی بعثت سے لے کر اُن کے انقلاب تک، اُن کے اذنِ حضوری سے لے کر دربارِ رسالت ﷺ میں حاضری تک، اُن کے واقعات سے لے کر احسانات تک، اُن کی دیانت سے لے کر تجارت تک الغرض کسی بھی حوالے سے اشعار میں اظہار کیا جائے تو وہ نعت کہلائے گا۔

لہذا منظر عارفی صاحب نے میری نظر میں نعت کی تعریف کو محدود کر دیا ہے۔ ہمیں ایسے شعرا کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے کسی بھی حوالے سے آداب کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے، افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے نعت گوئی کی صنف کو وسعت دی ورنہ تو آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تو تقدیسی ادب کو خالص ادب کا حصہ ہی شمار نہیں کرتے۔ مندرجہ ذیل نعوت کی مثال دی جا سکتی ہے:

مجھے ملا تھا سرِ شام اک ستارہ فروش
بنامِ نعت مجھے دے گیا پیامِ سروش
کی ہیں مہ و نجوم سے باتیں چمن چمن
اُترا ہے مجھ پہ نعت کا دیواں کرن کرن
پسِ ازل تھا ہویدا نہیں کیا جس کو
وہ ایک راز کہ افشا نہیں کیا جس کو

''اقرا'' کے ناعت نے اپنی کتاب کی کئی نعوت میں لفظی تکرار سے حسن اور رعنائی پیدا

کی ہے۔ اجرامِ فلکی اور بہار موسم کے تلازمات سے مدینہ نعت سجایا ہے۔ اُن کے کلام میں غزلیہ ہئیت کی زیادہ تر نعتیں غیر مردف ہی نہیں غیر معروف قوافی میں بھی ہیں جن کو صہبا اختر نے کمال مہارت سے برتا ہے کہ کہیں غرابتِ لفظی یا اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے حضورؐ کے اسمائے گرامی کو بھی خوب صورت سے نعتوں میں شامل کیا ہے مگر کہیں فصاحت متاثر نہیں ہوئی اس لیے کہ وہ اس طرح برتے گئے ہیں جیسے اُردو میں بولے جاتے ہیں۔ اس بارے میں ''اقرا'' کے خالق خود رقم طراز ہیں: ''میں نے اپنے اشعار میں کچھ عربی کے الفاظ، جن میں اسمائے رسول ﷺ بھی شامل ہیں اُسی طرح اُسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیے ہیں جس طرح وہ اُردو میں مستعمل ہیں یا بولے جاتے ہیں۔ اسے آپ میری عربی سے عدم واقفیت بھی سمجھ سکتے ہیں اور میرا جہل بھی۔ یہ میرا عجزِ بیاں بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور اگر آپ کچھ رعایتی نمبر دینا چاہیں تو اسے ضرورتِ شعری بھی کہہ سکتے ہیں''۔ انشا اللہ خاں انشا نے ''دریائے فصاحت'' میں ایک اہم اصول بیان کیا ہے جو صہبا اختر کی بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ انشا لکھتے ہیں کہ اپنے مادہ و ماخذ سے قطعِ نظر کوئی لفظ اسی طرح مستعمل ہے جیسے اسے مقامی لوگ بولتے ہیں۔

''اقرا'' کی پہلی نعتیہ نظم ہی مبنی بر اسمائے رسولؐ ہے۔ چوں کہ اللہ کے حبیب کے اسمائے مبارکہ کے اندر بھی معنویت کا ایک جہاں آباد ہے اگر آپ کے اسمائے مبارک کو بھی کسی شعری بحر میں باندھا جائے تو یقیناً ایک عمدہ اور بہترین تخلیق وجود میں آجائے گی۔ کچھ اِسی طرح کی کوشش صہبا اختر نے بھی کی ہے۔ اِس سلسلے میں وہ یہ وضاحت پہلے ہی کتاب کے دیباچے میں کر چکے ہیں کہ اِن صفاتی ناموں کو اُس تلفظ کے ساتھ نظم کیا گیا ہے کہ جو اُردو زبان میں مستعمل ہے اور یہی مناسب بات تھی کہ مقامی افراد جس طرح بولتے ہیں اسی طرح نظم کیا جائے۔

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن کی بحر میں اِس نظم کی پانچ بند ہیں اور ہر بند میں چار اشعار ہیں۔ پہلے تین بند میں تو آپ کے صفاتی ناموں ہی کا ذکر ہے۔ چوتھا بند ملاحظہ کیجیے جس میں شاعر کہتا ہے کہ حضور آپؐ ہر عہد میں آنے والے انسانوں سے افضل و اشرف ترین ہیں۔ وہ انسان

اولین ہوں، متوسلین یا متاخرین، آپ عرب وعجم کا فخر اور ناز ہیں۔ آپ عالمین کے لیے خیر ہی خیر ہیں۔ منبعِ لطف وکرم ہیں۔ تمام امتوں کے محسن ہیں۔ آپ کا نام نامی دل پر منقوشِ لوح وقلم ہے۔ زمین وآسماں بھی آپؐ کے گیت گاتے ہیں۔ زمین سے عرش تک آپؐ ہی کا نور پھیلا ہوا ہے جو بشر کی خدا تک رسائی کا سبب ہے۔ خود آپؐ کی رفعتِ پرواز کی انتہا اللہ کریم تک رسائی تھی:

عین قربِ خدا آپ کی انتہا
عرش تک آپ کا نور منزل رسا
آپ کا نام منقوشِ لوح و قلم
آپ فخرِ عربؐ آپ نازِ عجمؐ
آپ ہیں صاحبِ لطف و جود و کرم
آپ خیرِ جہاںؐ ، آپ خیر الامؐ
آپ کے نغمہ گر آسمان و زمین
سیّد الاولینؐ، اشرف الآخرینؐ

نعت گوئی کہ لیے بے حد ضروری ہے کہ نعت گو تاریخِ اسلام، حضور سے وابستہ مقاماتِ مقدسہ، آپؐ کے غزوات ومعجزات، بعثت سے پہلے عربوں کی حالت، انقلابِ محمدی، ممتاز ترین صحابہ، آپ کی اہم اور مشہور احادیث اور دیگر اہم باتوں سے آگاہ ہو کہ اِن تمام باتوں کا نعت گوئی سے گہرا تعلق ہے۔ صہبا اختر نے بھی اکثر نعتوں میں تلمیحات اور آپؐ کے معجزات کا ذکر کیا ہے: چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ مدینہ کچھ نجف کچھ کربلا کو دیکھ کر
ہاں محمدؐ کے سفر سے کچھ شناسا میں بھی ہوں
بھلا کر بو ذرؓ و سلمانؓ کو، اپنے نام کے آگے
''غلامِ سرورِ دیںؐ'' مجھ سے کم اوقات لکھتے ہیں

وہی قدسیؒ وہی جامیؒ وہی حسّانؓ ہو جائے
سلیقہ نعت لکھنے کا جسے امکان ہو جائے

غزلیہ ہئیت میں ''آخری ورق'' کے نام سے کتاب کی آخری نعت میں جو غیر مردف ہے، ''اقرا'' کے خالق اپنی کم مائیگی کو جبر مفلسی قرار دے رہے ہیں کہ مفلسی میں انسان بے مایہ بے حیثیت اور خالی جیب ہوتا ہے۔

کہتے ہیں میری تنگ دامانی کی وجہ سے خیال کی دولت دامن چھڑا رہی ہے۔ اِس وجہ سے میرے دل کا خون ہوا جا رہا ہے۔ کتاب میں سطور محدود ہیں اور دل کی بات نا تمام ہی رہ گئی ہے۔ ورنہ میرا قلم ایسی مدحت لکھتا کہ آپ کی احادیث کے ذکر سے دامنِ سحر کو پُرنور کر دیتا۔

اگرچہ غزلوں اور نظموں کا دامن اتنا وسیع نہیں ہے جس وجہ سے میں بھی مطمئن نہیں مگر میں تو اس بات پر آپ کا سپاس گزار ہوں کہ جو بھی ہنر عطا ہوا آپ ہی نے کیا ہے۔ بس حضور آپؐ سے اتنا کہنا ہے کہ میرے دل اور میرے شعری دیوان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں آپ کی خدمت میں اٹھا لایا ہوں۔ قبولیت کا شرف بخشیں۔ اُس نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

میری کتابِ نعت کا یہ آخری ورق
اک جبرِ مفلسی کے سوا کچھ نہیں حضورؐ
دامن کشِ خیال ہے وہ تنگ دامنی
کرتی ہے دل کا خون جو ہر حال میں ضرور
افسوس نا تمام رہی دل کی گفتگو
افسوس اختتام کو پہنچی شبِ سرور
دیوان اور دل میں مرے فرق ہے کہاں
دونوں سمیٹ لایا ہوں سرکارؐ کے حضور

اُن کی نعتیہ نظموں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حضور سرکارؐ کے حسن و جمال کو واضح

کرنے کے لیے استعارے اور علامتیں مناظرِ فطرت سے کشید کرتے ہیں۔جس سے نہ صرف کلام میں مقامیت پیدا ہوتی ہے بلکہ اسلوبِ بیاں کی رعنائی اور جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔اُن کی ایک نظم ''تصورِ حضورﷺ'' کا تفصیل سے ذکر ضرور کروں گا۔

یہ ایک مبسوط نظم ہے۔ویسے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ طویل نظمیں لکھنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔یہ گیارہ بند کی نظم ہے اور ہر بند میں پانچ مصارع ہیں۔صہبا نے اپنے کلام میں تخیل کا بھرپور استعمال کیا ہے۔اِس نعتیہ نظم کے عنوان پر غور کیجیے اور ہر بند کے آخر پر اِس مصرع کی تکرار دیکھئے کہ کیسا لطف اور سرور پیدا کر رہی ہے۔

''تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیا ہوں گے حضورﷺ''

صبح پو پھٹتی ہے،فضائے شب میں نور آجاتا ہے،پردۂ ظلمت سے روشنی کا ظہور ہوتا ہے تو شاعر کہتا ہے کہ یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ کیا ہوں گے حضورؐ مطلب یہ ''گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں''۔مناظر فطرت نے اپنا حسن حضورؐ کی ہستی کے جمال سے کشید کیا ہے۔

جب یہ مناظر انسان پر سحر طاری کر دیتے ہیں تو میرے حضورؐ کا کیا کہنا وہ کیا ہوں گے کہ اِن جمالیات کا منبع،محور و مرکز تو آپؐ ہیں۔صبح دم جب نہال خوشی سے جھومتے ہیں اور میرے تصور میں جب اذانِ بلالؓ چمک اُٹھتی ہے اور آپ کا نام اذان میں آتے ہی مجھ پر نور برسنے لگتا ہے تو خیال آتا ہے کہ میرے حضورؐ کیا ہوں گے۔کہتے ہیں تند و تیز آندھیاں جب بربادی کی نیت سے سنسناتی ہوئی آتی ہیں۔بجلیاں جب ٹوٹتی اور کڑکڑاتی ہیں۔دلوں پر انجانا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ایسے میں بھی دلِ ناصبور آپؐ کے صدقے میں مطمئن رہتا ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے حضور کیا ہوں گے۔یہ ایک عمدہ نظم ہے۔اِس کے دو بند دیکھیں جن کا میں نے مذکورہ بالا سطور میں ذکر نہیں کیا

کچھ نہیں ہے پاس میرے اک تصور کے سوا
یہ تصور بھی نہیں کچھ اک تحیّر کے سوا

پھر بھی جب میرا تحیر دیکھتا ہے کچھ ضرور
تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیا ہوں گے حضورﷺ
اُن کے قدموں کی تجلی میرے صبح و شام پر
وہ ہمہ رحمت ہیں صہبا اور اُن کے نام پر
بخش دیتا ہے خدا جب مجھ سے عاصی کے قصور
تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیا ہوں گے حضورﷺ

ایک اور نعتیہ نظم جس کا حوالہ میں ضرور دوں کا وہ ''احسانات محمدؐ'' غزلیہ ہئیت میں ہے جس کے کل ۱۷ اشعار ہیں جن میں ایک یک سر جدا گانہ اسلوب میں حضورؐ کے انسانیت پر احسانات کا ذکر کیا ہے۔

آپؐ انسانوں کے لیے قران حکیم کی صورت میں ایک مکمل ضابطۂ حیات لے کر آئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کفر وشرک کرنے والے، الحاد کی آغوش میں پرورش پانے والے مومن بن گئے۔ جہالت، کم عقلی اور بے شعوری کو شعور، آگہی اور فہم وادراک کی دولت میسر آئی۔ دلوں کی کتاب سے جہالت کے باب مٹ گئے۔ وحشت و درندگی کے باب مکمل طور پر بند ہو گئے۔ آپ نے وحدت کا درس دیا اور بکھرے ہوئے انسانوں کو محبت اور بھائی چارے کی لڑی میں پرو دیا۔

صہبا اختر نے جدید دور کے مسلمانوں پر طنز بھی کی ہے کہ حضورؐ نے تو ہمیں مسلمان، صاحبِ ایمان اور ایک بنایا تھا۔ ہم نے فرقہ پرستی شروع کر دی۔ انسانوں کو مذہب اور فرقے کے نام پر تقسیم کر دیا۔

آپ خود امّی تھے مگر غارِ حرا سے ایک نئی تہذیب اور انسانیت کی روشنی لے کر آئے۔ تہذیب، شائستگی، محبت اور صلۂ رحمی کا نہ صرف درس دیا بلکہ خود اُس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ گویا غارِ حرا سے روشنی کا ایک آفتاب جہاں تاب طلوع ہوا جس نے ہر سو ایمان وایقان کی روشنی پھیلا دی۔

باطل کے جھوٹے خدا پاش پاش ہو کر منہ کے بل زمین بوس ہوئے۔انسان نے خدائے واحد و یکتا کو ایمان کی روشنی میں پہچانا۔آپ کی ہدایت اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ شتر بانوں کو وہ چراغِ علم وحکمت عطا ہوا کہ وہ دنیا کے امام بن گئے۔آدمیت کو عزت و توقیر ملی اور رنگ ونسل کا تفوق خاک میں مل گیا۔

برتری کا معیار پاکیزگی،تقوی اور طہارت بن گئے۔ یوں امام الانبیاؐ نے دو عالم کے چہرے کو تازگی اور وقار بخشا۔آپؐ نے افلاک کی سیر سے بشریت کو عظمت عطا کی۔آپؐ اللہ کی مہمان ہوئے، وہاں تشریف لے گئے کہ جہاں حضرت جبریلؑ اور براق کی بساط بھی نہیں تھی۔ ستارے اور کہکشائیں آپ کی گردِ راہ قرار پائیں۔الغرض اُس ہستی نے پرچمِ اسلام کل عالم میں لہرا دیا کہ جس کی عظمتوں کے اعتراف میں اللہ کی ذات نے آسمان اُن کے قدموں میں بچھا دیا۔

بحر ہزج مثمن سالم

(مفاعیلن ۴ بار) میں لکھی گئی ''احسانات محمدؐ'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ جس کے سامنے آفاق نے اپنی کماں رکھ دی
سرِ لوح و قلم اُس نے ہماری داستاں رکھ دی
میں اندھا تھا مجھے اُس نے جمال آگہی بخشا
میں گونگا تھا مگر اُس نے مرے منہ میں زباں رکھ دی
وہ شہرِ علم،وہ معراجِ عقل و فکر تھا جس نے
سرِ دستِ جہالت، دولتِ لفظ و بیاں رکھ دی
جہاں میں پتھروں کے دل کچھ ایسے موم کر ڈالے
رگِ ہر سنگ میں جیسے ، کوئی موجِ رواں رکھ دی
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کی سر بلندی کا
خدا نے جس کے قدموں میں جبینِ آسماں رکھ دی

محمد مصطفےٰ ؐ کے ان گنت احسان ہیں ہم پر
مگر ہم نے گنوا کر آپ ہر تاب و تواں رکھ دی
محمد مصطفےٰ ؐ کے نام کی یکجائی تھی جس میں
مرے فرقہ پرستو تم نے وہ وحدت کہاں رکھ دی
اگر صہبا قبول افتد، زہے قسمت، زہے عزت
کہ میں نے اُس کے قدموں میں متاعِ جسم و جاں رکھ دی

نبیؐ کی پاک سیرت تھی یہی اُن کا طریقہ تھا
کہ شبنم سے بجھایا ہر شرارہ لکھ دیا جائے
(اکرم کُنجاہی)

طفیل ہوشیار پوری کا وسیع فکری کینوس

طفیل ہوشیار پوری ہمہ جہت شاعر اور مدیر تھے۔ فلمی گیت نگاری کے علاوہ انہیں غزل، رباعی، قطعات، دوہے، ملی نغمات، کلامِ اقبال اور نعت نگاری سے بڑا لگاؤ تھا۔ اُن کا یہ ملی نغمہ پاک فوج کے ترانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل پہلے یہ ایک فلم ''چنگیز خان'' کے لیے لکھا گیا تھا جسے عنایت حسین بھٹی نے گایا تھا:

اللہ کی رحمت کا سایہ، توحید کا پرچم لہرایا
اے مردِ مجاہد جاگ ذرا، اب وقتِ شہادت ہے آیا
اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر

اُن کے ے مجموعہ ہائے کلام شعلۂ جام، جام مہتاب، سوچ مالا، میرے محبوب وطن، تجدید شکوہ، حسنِ آخرت (نعتیہ مجموعہ) اور رحمتِ یزداں (نعتیہ مجموعہ) کے نام سے شائع ہوا۔ آخر

الذکر اُن کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اُن کے نعتیہ کلام کا ایک بڑ اوصف ہندی الفاظ وتراکیب کا استعمال ہے۔ خاص طور پر دوہوں میں یہ رس مقامیت کو واضح کرتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کہ دوہا بنیادی طور پر ہندی الاصل اور برصغیر کی مقامی صنف ادب ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی یادداشتیں بھی ''شعور اور لاشعور'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئیں۔ وہ ''محفل'' کے نام سے ربع صدی تک ایک ادبی پرچہ بھی جاری کرتے رہے جس میں خطوط کا حصہ بڑا اہم ہوا کرتا تھا۔ اُنہوں نے فلموں کے لیے گیت نگاری ہی نہیں کی ہرجائی، رخسانہ، حاتم، محفل، لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے لیے غزلیں بھی لکھیں مگر فلمیں فلاپ ہو جانے کی وجہ سے غزلیں مقبول نہ ہوئیں۔

ویسے تو اُنہوں نے اُردو فلموں کے لیے بھی نغمات تحریر کیے مگر انہیں خاص شہرت پنجابی گیت نگاری سے ملی۔ فلموں میں اُن کی آمد اِس انداز سے ہوئی کہ ریڈیو پر ملازمت کے دوران وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں انقلابی نظمیں بھی پڑھتے تھے۔ یہ بات وزیر اطلاعات ونشریات سردار پٹیل کو کھلتی تھی۔ ریڈیو میں اُن کے ایک افسر نے انہیں بلا کر کہا کہ ملازمت کر لو یا جلسوں میں نظمیں پڑھ لو۔ اُنہوں نے ملازمت ترک کر دی۔

ریڈیو کی عمارت سے باہر آئے تو مقبول گلوکار سلیم رضا سے ملاقات ہوئی۔ وہ انہیں لے کر فلم ڈائریکٹر ہربنس رائے کے پاس گئے۔ وہ فلم ریحانہ کے لیے کئی نغمہ نگاروں سے گیت لکھوا چکے تھے مگر بات نہ بنی۔ اُس نے ان سے ایک گیت لکھوایا جو اسے بے حد پسند آیا۔ یوں فلمی گیت نگاری کا آغاز ہو گیا۔

طفیل نے تقسیمِ ہند سے پہلے اور بعد میں چپکے چپکے، گلنار، تیری یاد، لارے، ہیر، شہری بابو، بے قرار، دو آنسو، شمی، انوکھی داستان، مندری، پتن، دلا بھٹی، چن ماہی، روحی، وعدہ، نمائش، شہرت، قسمت، دوپٹہ وغیرہ کے گیت لکھے جنہیں منور سلطانہ، عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم، کوثر پروین، زاہدہ پروین، فتح علی خان، سلیم رضا، امداد حسین وغیرہ نے گایا۔

طفیل بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ وہ ہندی اور پوربی انداز میں لکھتے تھے اور ایسے اشعار امیر خسرو کی یاد تازہ کرتے تھے۔ وہ مشرقی اقدار کا نمونہ ہی نہیں تھے۔ یہاں کی اعلیٰ اقدار پر قطعات اور رباعیات بھی کہتے تھے۔ علامہ کے کلام خاص طور پر شکوہ اور جوابِ شکوہ سے انہیں بہت لگاؤ تھا۔ انہوں نے نہ صرف اقبال کے کلام کی روح تک خود پہنچنے کی کوشش کی بلکہ اُنہوں نے اُن وجوہات کا بھی طنزیہ اسلوب میں جائزہ لیا جو ہمیں اقبال کے افکار سے دور لے گئے۔ ہم تہی دامن رہ گئے اور اغیار نے اُن افکار سے خوب استفادہ کیا۔ سیالکوٹ کے مشاعروں میں جب وہ تضمین کا تڑکا لگے ہوئے کلام کو پڑھتے تو سامعین بہت پسند کرتے اور داد دیتے۔

اُن کی پیدائش سیال کوٹ کے گاؤں بنی وال ۱۹۱۴ء کی ہے مگر چوں کہ آبا و اجداد کا تعلق ہوشیار پور سے تھا، یہ اپنے نام میں ہوشیار پوری کا لاحقہ استعمال کرتے تھے۔ کچھ محققین نے اُن کی پیدائش ضلع ہوشیار پور بھی لکھی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۸ برس تک مدرس رہے۔ ۱۹۴۵ء میں لاہور ریڈیو پر ملازم ہو گئے۔ شاعری سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کے تلامذہ میں سے تھے۔ ۹۷ برس کی عمر میں ۱۹۹۳ء میں آپ خالقِ حقیقی کے پاس چلے گئے۔

یہ زمین، آسمان بلکہ تمام کائنات سب کچھ حضورﷺ کے دائرۂ کار میں ہے۔ آپ بلا شبہ وجۂ تخلیقِ کائنات اور حاصلِ کائنات ہیں۔ آپ کی شہنشاہی کونین پر محیط ہے۔ آپ قیامت قائم ہونے کے بعد بھی عاصیوں کی امید کا مرکز ہوں گے۔ ہر شے منور اور روشن ہے تو اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو رخِ ہستی کا نور ہیں تو دوسری طرف دلِ کونین کی دھڑکن ہیں۔ گویا نظامِ کائنات رواں دواں آپ ہی کے دم سے ہے۔ نبضِ ہستی آپ ہی کی بہ دولت چل رہی ہے۔

آپ کا مقام صفِ رسولاں میں بھی بلند ترین، جلی اور سب سے ممتاز ہے۔ خود دو جہاں کے خالق کو آپؐ پر ناز ہے کہ کائنات میں کوئی آپؐ سا نہیں کوئی آپؐ کا ہم سر اور ثانی نہیں۔ ارض و سما کا حسن، حسن تب بنا جب آپ کے قدم چوم لیے۔ اجرامِ فلکی، چاند ستارے، مہر و ماہ سب آپ

ہی کے رخِ روشن سے تابانیاں پاتے ہیں۔ازل سے ابد تک آپؐ ہی کا نور ،ہر حسنِ درخشاں کا سر چشمہ ہے۔سبحان اللہ حکیم الامت شاعر مشرق نے کیا عمدہ بات کہی تھی کہ آپؐ کو لوح محفوظ سے لے کر الکتاب پکارا اور یہ بھی کہا کہ کانچ کے رنگ کا گنبد یعنی آسمان بھی تیری عمل داری میں ہے ۔کارخانۂ قدرت زیرِ آسماں جو رواں ہے وہ حضورؐ کے اختیار میں ہے۔ طفیل ہوشیار پوری مقامِ مصطفےٰ ﷺ کا شعور رکھتے ہیں۔وہ آپ کو ساقیٔ کوثر و تسنیم ،شمعِ ایماں اور شمعِ دیں پکارتے ہیں ۔اُن کا کہنا ہے کہ بزمِ عالم سجانے والے بھی آپؐ ہیں اور بزمِ کونین سجانے کے لیے بھی خود آپؐ تشریف لائے۔مزید لکھتے ہیں کہ آپ کے مقام اور مرتبے کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ جس ذرّۂ زمیں نے آپؐ کے نقشِ پا کو چوم لیا سجدہ گاہِ قدسیاں بن گیا

یہ زمیں آپؐ کی آسماں آپؐ کا
آپ سب کے ہیں سارا جہاں آپؐ کا
دونوں عالم پہ ہے خسروی آپؐ کی
ہے مکاں آپؐ کا لا مکاں آپؐ کا
آفتابِ زندگی کی اے شعاعِ اوّلیں
نور سے تیرے فلک روشن،درخشاں ہے زمیں
بزمِ عالم تیری خاطر کی گئی آراستہ
ساقیٔ تسنیم و کوثر ، شمعِ ایماں، شمعِ دیں
تیری سطوت تیری عظمت کا ہو اندازہ کسے
سجدہ گاہِ قدسیاں ہے تیرے مرقد کی زمیں

آپ کونین کی تاریکیوں کے لیے روشنی کا سر چشمہ ہیں۔اگر آپ تشریف نہ لاتے تو یقیناً اب تک ہم کعبے کو صنم خانہ بنائے ہوئے خود تراشیدہ اصنام کے سامنے سجدہ ریز ہوتے۔انسان سے انسان بیزار تھا۔بیداد کا سکہ چلتا تھا۔ذاتِ خدا آدمیت کے لیے وہم و گمان

سے زیادہ نہ تھی۔ بیٹی کو ندامت کا باعث خیال کیا جاتا تھا۔ توحید کا سورج کہیں گھنے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ شرک کی کثرت تھی۔ طفیل ہوشیار پوری کا کہنا ہے کہ آپؐ کے عالمِ انسانی میں مبعوث ہونے سے ذاتِ باری کی پہچان ہوئی۔ انسانی ذہن کو معبودِ حقیقی کے حوالے سے ایقان اور ایمان ملا۔ قلوب و اذہان کو وہ وجدان عطا ہوا، آپ کی رحمت جوش میں آئی اور آدمیت کو حسنِ نظر عطا ہوا۔ معراجِ نظر ملی کہ بہت سے نہاں اسرار منکشف ہو گئے۔ قطرے کے بحر اور ذرّے کو آفتاب سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ ملا۔ ہمیں کوئی سچا راہبر میسر نہ ہوتا اور ہم بھی راہ گم کردہ راہزن ہی کہلاتے۔ گویا جہانِ آب و گِل میں جہالت اور ظلم و جبر ہی کا راج ہوتا۔ دوسرے کا احساس تک نہ ہوتا صرف اپنی خواہشات نفس کی غلامی کر رہے ہوتے۔ بہمیت رقص کناں رہتی، شرف انسانی عنقا ہوتا۔ خدا شناسی نہ ہوتی۔ خدا اور آخرت کا تصور نہ ہونے سے انسان انسان پر خدائی کر رہا ہوتا آپ سراپا عفو و درگزر تھے۔ طفیل ہوشیار پوری اُس انقلابِ محمدی کا مکمل ادراک رکھتے ہیں جو آپؐ کے دنیا میں تشریف لانے سے سرزمینِ حجاز اور پوری دنیا میں برپا ہوا۔ آپ روشنی کا حسین مینار بن کر آئے کہ جس کی ہر کرن دنیا و دیں میں راہنمائی کا درجہ رکھتی ہے۔

سردارِ انبیاؑ کا بنیادی کام اور پیغام ہی توحید کا تھا بلکہ دنیا میں جتنے بھی انبیاؑ مبعوث فرمائے گئے اُن کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ عقیدۂ توحید ہی تھا۔

طفیل ہوشیار پوری کو اِس بات کا مکمل احساس تھا اسی لیے اُن کے تقدیسی کلام کا خاصہ حصہ رسالت مآبؐ کے اُس انقلاب کے بیان پر مبنی ہے جس کا تعلق اللہ کریم کی صفتِ یکتائی سے ہے:

آپؐ آئے لٹاتے ہوئے تسکین کی دولت
تسکین کی دولت تھی کہاں، آپؐ سے پہلے
تو نے ہی آ کر کیے صیقل دلوں کے آئینے
ورنہ ان دیکھے خد پر کون لاتا تھا یقیں

کفر و الحاد کی آغوش میں پلنے والے
ہو گئے صاحبِ ایمان، ترے آنے سے
کرتی رہی ہے ناز سدا اُس پہ زندگی
جس نے بدل کے رکھ دیا دھارا حیات کا

شاعر کا کہنا ہے کہ اگر آپؐ نہ آتے تو گمراہ آدمیت تک خدائے ہست و بود کی ہدایات نہ پہنچ پاتیں۔ انسان کو اُس مقام و مرتبے کا احساس تک نہ ہوتا جو اللہ کی ہستی نے کائنات میں نوعِ انساں کو بخشا ہے۔

انوار کی ایسی برسات ہوئی کہ کفر و باطل کے اندھیرے چھٹ گئے۔ ماضی کے باطل نقش مٹ گئے۔ فرسودہ رویات کا خاتمہ ہوا۔ تابندہ عہد کا آغاز ہوا اور نئی روایات نے جنم لیا۔ ہر طرف عطا اور عنایات کا وہ ابرِ کرم برسا کہ ترسے ہوئے انسان نہال ہو گئے۔

آپؐ آئے تو گویا خزاں کا موسم بہاروں میں بدل گیا۔ زندگی کے در و دیوار روشن روشن ہو گئے۔ خیر و شر کا تصور اور جزا و سزا کی عدالت قائم ہوئی۔ برتری کے معیارات تبدیل ہوئے۔ شرف اور بڑائی، تقوی اور پرہیزگاری میں آ گئی۔ صحرائے روح کے لیے آپ سائبان بن گئے۔ آپ کی بعثت کے عرب معاشرے اور عالمِ انسانیت پر جو اثرات مرتب ہوئے طفیل ہوشیار پوری کے کلام میں اُس پر خاصے نعتیہ اشعار موجود ہیں۔

پتھروں کی رہیں آپؐ پر بارشیں
پھر بھی دامن رہا گل فشاں آپؐ کا
ہے سبھی کچھ طفیلِ حزیں کے لیے
آسرا شاہِ کون و مکاں آپؐ کا
گمراہ بشر تک نہ پہنچتیں، مرے آقاؐ
فطرت کی ہدایات اگر آپؐ نہ آتے

اے ابرِ کرم، بحرِ عطا، کون سمجھتا
مفہومِ عنایات ، اگر آپؐ نہ آتے
ذاتِ حق کا ہوا عرفان ترے آنے سے
ہوئی اللہ کی پہچان ترے آنے سے
پردۂ ذہن میں مستور تھی ذاتِ باری
دل بنے مرکزِ ایقان ترے آنے سے

آپ کا فیضان ہے کہ آپ کی آمد سے قرآن آیا اور دستورِ حیات مرتب ہوا۔آپ غارِ حرا سے لوح وقلم لیے ہوئے اترے۔آپ بظاہر امی لقب تھے مگر تلمیذ الرحمٰن تھے۔آپ شہرِ علم اور محرمِ رازِ حیات و کائنات تھے اسی لیے آپؐ کے دم سے جہل کو آگہی بصیرت کی روشنی نصیب ہوئی۔ آئینِ زندگی ایسا بنا کہ عدل کی میزان کا دور دورہ ہو گیا۔اِس جہان میں بھی غریبوں، بے نواؤں اور بے سہاروں کو سہارا ملا۔عزت وتوقیر ملی اور عاصیوں کے لیے روزِ محشر بھی آپ شافعِ محشر بنیں گے۔بخشش کی امید اور سہارا ہوں گے۔آپ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کا کتنا حسین پہلو ہے کہ دشمنوں کے حق میں بھی خیر اور سلامتی کی دعائیں کیں۔یوں نہایت نرم خوئی،حسن کردار واِخلاق اور شیریں کلامی سے انہیں اپنا ہم نوا بنایا۔

ایک زمانہ تھا کہ نعت گوئی کے موضوعات سراپا نگاری، حاضری وحضوری کے لیے تڑپ ،عقیدت ومحبت کا اظہار خصوصاً مقاماتِ مقدسہ اور مدینہ منورہ تک محدود تھے۔طفیل ہوشیار پوری نعت نگاروں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں کہ جنہوں نے آپؐ کی سنت وسیرت کو بھی موضوع کے طور پر اپنایا اور نعت کو موضوعاتی وسعت سے آشنا کیا۔مختصر یہ کہ آپؐ دونوں جہانوں میں رحمت للعالمین ہیں۔ قیامت کے روز بھی سبھی کو آس کملی والے ہی سے ہوگی۔

بادشاہوں کے مقدر میں نہ تحریر ہوئی
جو گداؤں کو ملی شان، ترے آنے سے

کیوں نہ اے شافعِ محشر، ترا مانیں احسان
بخششوں کا ہوا سامان، ترے آنے سے
حسیں کردار سے، اخلاق سے، شیریں کلامی سے
رسولِ پاکﷺ سے سیکھو دلوں کو ہم نوا کرنا
نبیؐ کے اسوۂ حسنہ سے یہ پیغام ملتا ہے
یتیموں کی خبر رکھنا، غریبوں کا بھلا کرنا
درِ نبیؐ سے جو مانگو وہ بے حساب ملے
دعا کرن کے لیے ہو تو آفتاب ملے
عطائے شہرِ مدینہ کا ذکر کیا کیجئے
قدم قدم پہ کھلے رحمتوں کے باب ملے

ہر نعت گو کے کلام میں اذنِ حضوری کی خواہش اور دربارِ نبوی میں حاضری کی تڑپ موجزن ہوتی ہے کہ وہاں جا کر اور سیدِ کونین کے در سے وابستہ ہو کر بجھے ہوئے چراغِ فکر و نظر کو بھی نئے نئے افکار کی تابش عطا ہوتی ہے۔ وہ اگر چاہیں تو حرف کو لازوال کر دیں وہ اگر چاہیں تو افکار کو حرفِ لعل و گہر بنا دیں۔ طفیل کی تڑپ اور قلبی کیفیت ملاحظہ کیجیے:

جانے کب حاصل ہو بطحا کی زیارت کا شرف
جانے کب نکلے تمنائے دلِ اندوہ گیں

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ حاضری کے بعد کی دلی کیفیات بھی ضرور رقم کرتا ہے لیکن یہ عشقِ مجازی نہیں کہ انسان وصل سے شاد کام ہو جائے، پیاس بجھ جائے۔ اُس کیفیت کی اظہار میں بھی ایک تشنگی سی پائی جاتی ہے کہ کاش تھوڑا وقت اور مل جاتا۔ کاش حضورﷺ پھر بلائیں اور میں اڑ کر وہاں پہنچوں۔

طفیل ہوشیار پوری رزق روٹی کے لیے فلم نگری سے وابستہ رہے مگر دبستانِ فلم کو بہت

فائدہ ہوا۔ وہ ایک کھرے محبِ وطن اور سچے عاشقِ رسول تھے۔ اُن کی کئی ایک نعوت حاضری کے بعد کی قلبی کیفیات کے اظہار پر مبنی ہیں۔ جن میں روانی، تسلسل اور ایک ہی فضا اور کیفیت کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

جس میں سرور و کیف ہے، دربارِ مصطفےؐ کی نعمتوں کی بات ہے۔ اُن بخششوں اور عنایتوں کا ذکر ہے جن سے زائر کا دامن مالا مال ہو جاتا ہے۔ ذرے آفتاب اور قطرے دریا بن جاتے ہیں۔ طفیل چاہتے ہیں کہ وہاں جائیں اور ہر ہر پل سرتاجِ انبیاًؐ کی مدحت کرتے رہیں۔ روح وانوارِ آگہی سے آشنا کریں۔

اُن کا کہنا ہے کہ طیبہ میں ہم جس طرف بھی گئے سیدِ لولاک کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اُن کے کلام میں غارِ حرا سے پھوٹنے والی روشنی کے عالم پر اثرات کا تذکرہ ہے۔ وہاں پہنچ کر دل کو جو سوز وگداز اور آنکھوں کو اشکوں کی سوغات ملتی ہے اُس کی بات ہے۔ رسول ہاشمیؐ مومنین پر احسان فرماتے ہیں کہ وہاں اُنہیں شعورِ خود شناسی ملتا ہے۔ ایسی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دل کو سرور و کیف کی کیفیتیں ملیں
دربارِ مصطفےؐ سے بڑی نعمتیں ملیں
غارِ حرا کے قرب سے جس دم گزر ہوا
قرطاسِ دل پہ ابھری ہوئی آیتیں ملیں
دامن میں بخششوں کے خزانے لیے ہوئے
مجھ کو تلاش کرتی ہوئی رحمتیں ملیں
انوارِ آگہی سے ہوئی روح آشنا
سنگِ درِ حضورؐ کی جب قربتیں ملیں
دل کو متاعِ سوز محبت ہوئی عطا
آنکھوں کو آنسوؤں کی حسیں دولتیں ملیں

طیبہ میں جس طرف بھی جہاں بھی گئے طفیل
زلفِ رسولِ حقﷺ کی ہمیں نکہتیں ملیں

مومن مومن نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی اُس کا ایمان کامل ہوتا ہے جب تک وہ اپنے ماں باپ، اپنی آل اولاد، الغرض ہر شے سے زیادہ آپؐ سے محبت کرنے والا نہ بن جائے۔ یوں کہیے کہ آپؐ کی محبت ایمان کا بنیادی جزو اور تقاضا ہے۔ آپ کا نام وردِ زباں ہونا اِس لیے ضروری ہے کہ وہ ہماری عبادات کا لازمی حصہ ہے۔ طفیل لکھتے ہیں کہ جب عشقِ نبیﷺ کا قرینہ آتا ہے تو انسان مکہ اور مدینہ کے دستور کو سامنے رکھتا ہے۔ اسی لیے متاعِ عشقِ نبیؐ ہر وقت میرے دل میں رہتی ہے۔ جدھر چلوں تری یادوں کا ساتھ رہتا ہے۔

جہاں رہوں تیری ہی صورت نظر میں رہتی ہے۔ شمع عشقِ رسولﷺ چوں کہ میرے دل میں ضوبار ہے۔ اس لیے میری زندگی کا لمحہ لمحہ روکشِ انوار ہے۔ یہ میرے عشق کی کیفیت ہے کہ ہر وقت میری آنکھ کی پتلی میں روضۂ سرکار کا عکس رہتا ہے۔

یہ عبادت، عبادت کی معراج ہے
نام ہر دم ہو وردِ زباں آپؐ کا
ہر نفس نکہت و نور ہے سر بسر
نام جب سے ہوا حرضِ جاں آپؐ کا
دل میں ضیا فگن ہے یوں نام مصطفےؐ کا
انگشتری میں جیسے تابندہ اک نگینہ
عشقِ نبیؐ کی جس میں مشعل ہوئی فروزاں
معمور کیوں نہ ہو گا انوار سے وہ سینہ
ہے یہ عشقِ مصطفےؐ، معراجِ عشقِ مصطفےؐ
آنکھ کی پتلی میں عکس روضۂ سرکار ہو

جس طرح طفیل کی نعتیہ شاعری میں حاضری وحضوری کی کیفیات اور ظہورِ مصطفےؐ کے بعد انقلاب محمدی ﷺ اور معراج کے معجزے پر غزلیہ ہئیت میں مسلسل اشعار ملتے ہیں۔اسی طرح اُن کے ہاں امام المرسلین کے حسن و جمال پر بھی تقدیسی خزانے کی کمی نہیں۔بزمِ کونین میں جتنی بھی رعنائیاں اور بزم آرائیاں ہیں اُن کے آرائشِ جمال کا سبب ہیں۔وہ آپؐ ہی کے عکس جمیل کے سبب سے ہیں،ساغر صدیقی نے سچ ہی تو کہا تھا کہ

''بزمِ کونین سجانے کے لیے آپؐ آئے''

آپؐ کے نقشِ پا سے عالمِ رنگ و بو میں بہاروں کو فروغ ملتا ہے۔تزئین شش جہات ہوتی ہے۔صحنِ گلشنِ حیات میں جو بھی گل ہائے رنگ ہیں وہ آپ ہی کے چہرے سے شادابی پاتے ہیں۔ہر ہر حسیں منظر میں جمالِ مصطفےٰ ﷺ آئینہ دار ہے۔آپ کے ذات جمیع صفات ہے۔آپ روحِ کلیم، دمِ مسیحا اور رشکِ حسنِ یوسف کا خلاصہ ہیں۔طفیل ہوشیار پوری کا بھی یہی کہنا ہے کہ آپؐ زینتِ بزمِ ہر دوسرا ہیں۔حسنِ تخلیقِ جہاں کی غرض و غایت آپؐ ہی ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ نورِ ازل کی ضیا آپؐ ہی ہیں۔اُن کا تیقن اور ایمان ہے کہ بزمِ کونین کی ابتدا و انتہا آپؐ ہی ہیں۔

نورِ صبحِ ازل کی ضیا آپؐ ہیں
اپنے جلووں کے خود آئینہ آپؐ ہیں
حسنِ تخلیق کا مدعا آپؐ ہیں
زینتِ بزمِ ہر دوسرا آپؐ ہیں
آفتابِ زندگی کی اے شعاعِ اوّلیں
نور سے تیرے فلک روشن، درخشاں ہے زمیں
پھیلی ہے تری خوشبو اقصائے دو عالم میں
اے پیکرِ زیبائی ، اے لالۂ صحرائی

آپ کے دم سے معطر ہو گئے کون و مکاں
بوئے گُل کا سحر ٹوٹا آپ کی نکہت کے بعد

ہر سانس ناؤ کیجیے درپیش ہے سفر
دریا کی موج موج میں منجدھار یارسول ﷺ
(اکرم کُنجاہی)

قتیل شفائی کا نذرانۂ عقیدت

محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات سے محبت کرنے والا شاید ہی کوئی شخص ہو جس نے یہ بے مثال اور مشہور نعتیہ شعر نہ سنا ہو:

دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفیٰؐ کے بعد

اِس شعر کے خالق معروف ومقبول گیت نگار قتیل شفائی ہیں۔اصل موضوع یعنی اُن کی نعت نگاری کی طرف آنے سے پہلے چند باتیں اُن کی گیت نگاری سے متعلق عرض کروں گا۔اگر پاکستان کے مقبول ترین نغمہ نگار کی بات ہو تو میرا خیال ہے کہ فلمی موسیقی سے معمولی دل چسپی رکھنے والا بھی قتیل شفائی کا نام لے گا۔وہ بلا شبہ ایک ایسے شاعر ہیں کہ جن کی ادبی حیثیت بھی مسلمہ ہے۔اُنہوں نے تقسیم ہند سے پہلے بھی ایک فلم کے گیت تحریر کیے تھے مگر تقسیم کے ہنگاموں کی وجہ سے فلم مکمل نہ ہو سکی۔قیام پاکستان کے بعد اُنہوں نے پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' کے لیے نغمات تحریر کیے۔

اُنہوں نے تقریباً ۳ سو فلموں میں گیت نگاری کی جن میں محبوبہ، گلنار، قاتل، نوکر،

حمیدہ، انتظار، اولاد، عشقِ لیلیٰ، ناگن، محبوب، عشق پر زور نہیں، اک تیرا سہارا، ہیڈ کانسٹیبل، شباب، چنگاری، حویلی، فرنگی، دیوداس، نائلہ، پائل، جانِ آرزو، دل میرا دھڑکن تیری، پاک دامن، سزا، دل بیتاب، ہمراز، ناز، نجمہ، آنسو بن گئے موتی، محبت، سلام محبت، دامن اور چنگاری، مطربہ، آگ، انارکلی وغیرہ شامل ہیں۔

اُن کا نام فلموں میں کامیابی کی ضمانت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نیشنل ایوارڈ، مصور ایوارڈ، نگار ایوارڈ (۳ بار)، آدم جی ادبی ایوارڈ بھی ملا۔ انہوں نے تقریباً ۵۰ سال فلم نگری میں گزارے۔ کوئی غیر معیاری گیت نہیں لکھا۔ انہیں تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

قتیل شفائی ایک محبِّ وطن شاعر تھے۔ اُنہوں نے جس طرح بے مثال فلمی گیت لکھے اُسی طرح لاجواب قومی نغمے بھی تحریر کیے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ چونڈہ کے میدان میں لڑی گئی۔ ہمارے چند ٹینکوں نے 600 بھارتی ٹینکوں کو نہ صرف روکا بلکہ اللہ کی مدد سے پسپا بھی کیا۔ کتنے ہی پاکستانی سپاہی یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ اس پر قتیل شفائی نے ایک اثر انگیز نغمہ لکھا جو نسیم بیگم کی آواز میں ریکارڈ ہوا:

لائی ہوں میں تمہارے لئے پیار کا پیام
اے پھول سے مجاہدو تم کو میرا سلام
اے مادرِ وطن اونچا ہو تیرا نام

قتیل ۱۹۱۹ء میں ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی طور پر راولپنڈی کے ایک بزرگ شفا سے اصلاح لیتے تھے، اس لیے شفائی اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔ جلد لاہور چلے آئے اور فلمی گیت نگاری سے منسلک ہو گئے۔ پہلا مجموعہ کلام ۱۹۴۲ء میں ہریالی کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اُن کے ڈیڑھ درجن سے زیادہ مجموعے اشاعت پذیر ہوئے، جن کی مقبولیت کی وجہ سے کئی کئی ایڈیشن منظر عام پر آئے۔

جلترنگ، مطربہ، روزن، گھنگھرو، جھومر، گفتگو، سمندر میں سیڑھی وغیرہ بہت اہم

ہیں۔ قتیل ترقی پسندانہ نظریات کے حامل تھے۔ اُن کا معاملہ بھی عارف عبدالمتین کی طرح تھا۔ زندگی کے آخری برسوں میں سرزمینِ حجاز کی زیارت کے بعد اپنے سابقہ نظریات سے تائب ہوئے اور کہا کہ میرے اندر وحدت کا چراغ اپنی کامل تابانیوں کے ساتھ جگمگا اٹھا ہے اِس لیے اب میں اپنے اندر آباد کفر و شرک کے بتوں کو چکنا چور کر رہا ہوں:

دامن چھڑا چکا ہوں میں غفلت کی نیند سے
بیدار کر چکی ہے اَذانِ سحر مجھے
کر رہا ہوں اپنے اندر کے بتوں کو پاش پاش
دل میں روشن قُل ھُو اللہ کا دیا ہونے کے بعد
سارا جہان مجھ کو موحّد کہے قتیل
پوری نہ ہو گی کیا میری اتنی سی آرزو

نعت گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور نعت نگاری کو نہ صرف خود بھی بڑا اعزاز سمجھا بلکہ اپنی ایک نعت میں قمر اجنالوی کے نعتیہ قصیدے کی بے انتہا تعریف کی ہے۔

مطلع اور مقطع ملاحظہ کیجیے:

بن گئی نعتِ نبیؐ سب سے بڑی صنفِ سخن
ہم نوازے جا رہے ہیں اِس بڑے انعام سے
میری تمام شاعری پھول ہی پھول ہو گئی
میں نے کہی تھی جو غزل نعتِ رسولؐ ہو گئی
اُس پر کھلا درِ دل و دیدہ رسولؐ کا
لکھا ہے جس قلم نے قصیدہ رسولؐ کا
ہے لائقِ جزا قمر اجنالوی قتیل
اُس شخص نے کہا ہے قصیدہ رسولؐ کا

ایک خوب صورت نعتیہ مجموعہ ''نذرانہ'' کے نام سے دربارِ رسالتﷺ میں قبولیت کے لیے پیش کیا۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۰ء میں اُن کی وفات سے صرف ۷ ماہ پہلے اشاعت پذیر ہوا۔ اِس مجموعے کو صدارتی ایوارڈ کا حق دار بھی قرار دیا گیا۔ اِس نعتیہ مجموعے میں شامل کلام اُن نعوت پر مشتمل ہے جو قتیل نے اپنی علالت کے ایام میں کہی تھیں۔ کتاب کی پہلی نعت کے آغاز میں مندرجہ ذیل نوٹ بھی شامل ہے:

''بسترِ علالت پر بیماری سے منہ موڑ کر غزل کہنا چاہتا تھا کہ نعت نے راستہ روک لیا اور میری جھولی میں چند پاکیزہ اشعار ڈال دیئے۔ یہ میرے لیے عشقِ رسولﷺ کی دین ہے جس میں آپ کو بھی شریک کر رہا ہوں''۔ مذکورہ نعت کے اشعار بھی حسبِ حال ہیں جو اُن کی دلی کیفیت کے عکاس ہیں:

جی رہا ہوں حاصل اُن کا اسرا ہونے کے بعد
راز مجھ پر یہ کھلا بے دست و پا ہونے کے بعد
بادشاہی سامنے آئے تو ٹھوکر مار دوں
یہ ملا رتبہ محمدﷺ کا گدا ہونے کے بعد

''نذرانہ'' میں حمد، نعوت، سلام اور مناقب شامل ہیں۔ کئی نظموں میں اللہ کی یکتائی و حدانیت کا آفاقی پیغام ہے۔ اُس شعری مجموعے کے مطالعے سے ایک بات پورے تیقن سے کہی جا سکتی ہے کہ قتیل نے حمد و نعت میں ایک حدِّ فاصل قائم رکھی ہے۔ نعت حمد سے زیادہ احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے اِس لیے اُنہوں نے نعت کے معاملے میں کفر و شرک سے پہلو بچایا ہے۔

اُن کے ہاں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے کہ کون سا شعر حمد کا ہے اور کون سا نعت کا۔ کئی اشعار میں اُنہوں نے نعت کا تعلق کس کمال ہُنر مندی سے خدائے بزرگ و برتر سے جوڑا ہے۔ اُن کے نزدیک بھٹکے ہوئے انسان کو نبیؐ کی ذات کے وسیلے نے خدا کی پہچان کروائی ورنہ انسان کفر و شرک کے اندھیروں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

کئی تقدیسی تخلیقات میں وہ حمد اور نعت کو اِس طرح ساتھ لے کر چلے ہیں کہ ایک ہی تخلیق میں حمد اور نعت کے اشعار کو بڑی سہولت کے ساتھ الگ الگ کیا جا سکتا ہے یعنی قتیل سا شاعر جو ترقی پسندی میں اِس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ دینی اقدار سے دور ہو چکا تھا مگر خدا کی خدائی اور مصطفےٰ کی مصطفائی کی حدود سے بہ خوبی آشنا تھا اور اُس کا گہرا شعور رکھتا تھا جس کا اظہار ’نذرانہ‘‘ میں ملتا ہے۔ کئی اشعار تو ایسے ہیں کہ حمدیہ بھی ہیں اور نعتیہ بھی مگر سبحان اللہ مضمون اِس مہارت سے باندھتے ہیں کہ افراط وتفریط سے صاف دامن بچا لیتے ہیں:

نعتِ رسولﷺ لکھ کر تیری داد پاؤں گا
مجھ کو تیرے حضورؐ میں ہونا ہے سرخرو
تعلق ہے مرا اہلِ نظر کے اُس قبیلے سے
خدا کو جس نے پہچانا محمدؐ کے وسیلے سے
اُن سے جو چاہے زمانہ چاہے
میں محمدؐ سے خدا چاہتا ہوں
تیری توحید کی دہلیز پر لایا وہی ہم کو
اگر ایسا نہ ہو سکتا تو انساں در بہ در ہوتا
اے خدا، میرے خدا، میرے محمدؐ کے خد
کوئی دنیا میں محمدؐ سا اگر ہے تو بتا

زیادہ تر نعتیں غزل ہی کی ہیئت میں ہیں مگر نثری نظم اور مثنوی کی ہیئت میں بھی مختصر نظمیہ نعتوں کے علاوہ چند گیت نما نعوت بھی ہیں جو اِس لیے ضروری تھیں کہ قتیل بلا شبہ دبستانِ فلم کے اہم ترین گیت نگار رہے ہیں۔

اُن کا ایک گیت نما سلام بہ حضور خاتم الانبیاﷺ ملاحظہ کیجیے کہ جس میں آپ کا مقام اور آپ کی شان بیان کی گئی ہے کہ چاند تارے بھی اُن کو سلامی پیش کرتے ہیں۔ وہ جو عرش پر

بلائے گئے، وہ جو نبیوں میں سب سے آخری ہیں جن کے بعد کوئی نبی دنیا میں نہیں آئے گا، اُن کی غلامی میرے لیے باعث فخر ہے۔

جن کا محمدﷺ ہے نام اُن پر درود و سلام
وحدت ہے جن کا کلام اُن پر درود و سلام
دنیا ہے تابندہ جن کے کرم سے
زندہ ہے انسانیت جن کے دم سے
یاد آئیں جو صبح و شام اُن پر درود و سلام
جن کا محمدﷺ ہے نام اُن پر درود و سلام
دیں جن کو چاند اور تارے سلامی
ہے باعثِ فخر جن کی غلامی
ہم سب ہیں جن کے غلام اُن پر درود و سلام
جن کا محمدﷺ ہے نام اُن پر درود و سلام
مہمان بنے ہیں جو عرش کے
جو آخری ہیں پیغمبر خدا کے
جن پر نبوت تمام اُن پر درود و سلام
جن کا محمدﷺ ہے نام اُن پر درود و سلام

ایک مسلمان کے لیے جہاں بھر کے خزانوں یا دنیا کی بادشاہی سے کہیں بہتر اور قابل عزت وتکریم ہے کہ وہ محمد مصطفےﷺ کے در کی گدائی کا اعزاز پا جائے۔ قتیل کا کہنا ہے کہ جب صاحبِ ایمان کو کوئی شاہِ یثرب کا غلام کہتا ہے تو اُس کا شرف اور وقار بڑھ جاتا ہے۔ اِس لیے کہ اِس دنیا میں اگر اُن کی سیرت کا شعور انسان کی کامیابی کا ضامن ہے تو روزِ محشر اُن کی شفاعت آپ کی امت کے خطا کاروں کی مددگار اور بخشش کا ذریعہ ہوگی۔

اِس دنیا میں ایک صاحبِ ایمان کا جتنا وقار اور قد ہے وہ آپ ہی کی نسبت سے ہے۔ قتیل شفائی کا کہنا بھی یہی ہے کہ مجھ عاصی و گنہگار پر سیّد البشر کی اتنی عنایات ہیں کہ جن کی حد ہے نہ جن کا کوئی شمار۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے کسی حاسد کی نظر ہی نہ لگ جائے

جب ہمیں کہتا ہے کوئی شاہِ یثرب کا غلام
اپنی عزت اور بڑھ جاتی ہے اِس الزام سے
رشک سے کیوں نہ تکے رفعتِ افلاک مجھے
لوگ کہتے ہیں غلامِ شہِ لولاکؐ مجھے
بخش دی اُس سے زیادہ میرے آقا نے مجھے
جتنی درکار بلندی ہے میرے قد کے لیے
لگتا ہے مجھ پہ خاص کرم ہے حضور کا
ڈرتا ہوں لگ نہ جائے کسی کی نظر مجھے

وہ جو بظاہر اُمّی تھے۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کہلائے۔ جہاں بھر کے علوم اُن کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ جن کی عظمت یہ ہے کہ اُس مقام سے آگے بھی تشریف لے گئے جہاں سے آگے حضرت جبریلؑ کے پروں کی سکت بھی نہیں تھی مگر وہاں بھی آپؐ اللہ کے مہمان بن کر تشریف لے گئے اور آدمیت کو ہمیشہ کے لیے سر بلندی عطا کی۔ اِس طرح شاعر نے اپنی نعوت میں حضورؐ کے معجزات کو بھی فراموش نہیں کیا۔ حضورؐ کے مقام و مرتبے کو بیان کرتی اُن کی ایک نظمیہ نعت ''سب سے افضل، سب سے اعلیٰ ۔۔۔ کون؟'' جسے نثری کہنا ہی مناسب ہوگا، اُس میں شاعر نے محسنِ عالمؐ کے ہمہ گیر انقلاب کا دل پذیر انداز میں ذکر کیا ہے کہ کس طرح آپ نے کفر و شرک کے بتوں کو پاش پاش کر کے انسانوں کے خدائے یکتا کے سامنے جھکا دیا۔

باطل قوتوں کو شکست دی اور حق و صداقت کا پرچم بلند کیا۔ انسانیت میں مساوات قائم کی۔ رنگ و نسل کے بت توڑ کر انسانیت کو محبت کی لڑی میں اِس طرح پرو دیا کہ حضرت بلالؓ جو

حبشی نسل سے تعلق رکھتے تھے انہیں اسلام کا پہلا موذن بنا دیا۔

یہ کمال اُس ہستی کا تھا کہ جو بادشاہوں کا بادشاہ تھا اور تن پر کالی کملی رکھتا تھا۔ قتیل چوں کہ ایک اہم ترقی پسند شاعر تھے۔ انسانوں کے لیے حق اور سچ کی آواز اٹھاتے رہے۔ لہذا وہ نعت کے اشعار میں بھی اِس بات کا اہتمام ضرور کرتے ہیں کہ انسانیت کی آزادی کا پہلا درس اور منشور تو خود ہم سب کے آقاؐ نے دیا تھا

ہاتھ اُن کے چومنے کو آئے جہاں بھر کے علوم
ایک اُمّی کے محمد مصطفےٰ ﷺ ہونے کے بعد
جن کی عظمت نہیں محدود کسی حد کے لیے
عرش نذرانہ نما آپ کے گنبد کے لیے
جو بھی کسی کا حق تھا وہ حق آپؐ نے دیا
جمہوریّت کا پہلا سبق آپؐ نے دیا
ہر شخص کو بنا دیا موسیٰ کا جانشین
فرعونِ وقت کو یہ قلق آپؐ نے دیا

کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک اہلِ ایمان پیارے نبی ﷺ سے وابستہ مقامات، اشیا اور معجزات کا ذکر نہ کریں۔ وہ تو شہرِ مقدس کی خاک کو اکسیر اور آب و ہوا کو شفا کا باعث سمجھتے ہیں۔

چوں کہ ہر وہ شعر کہ جس میں حضورؐ یا حضورؐ سے متعلق عقیدت و محبت سے اظہار کیا جائے نعت ہے۔ قتیل نے ایک طرف تو پیارے رسول ﷺ سے عشق و محبت کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف اپنے احباب سے کہتے ہیں کہ اگر دونوں جہانوں میں کامیابی و سرافرازی چاہتے ہو تو محمد ﷺ کی محبت اور اُن کی سیرت کو ایک دائرہ سمجھتے ہوئے اِس کے اندر رہو۔

صدقِ دل سے شہِ ابرارؐ احمدِ مختارؐ کی سیرت کو عام کرو۔ اُس پیکرِ کردار کی ہمہ گیر صفات سے اپنے راستے روشن کرو جس نے نہ صرف دوستوں کو ذرّے سے آفتاب کیا بلکہ دشمنوں سے بھی

مروت کا سلوک کیا۔اُن کی سیرت وکردار کی خوبی یہ ہے کہ ۱۵ سو سال بعد بھی اُن کی خوشبو اور مہکار سے انسانیت اپنی سانسوں کو معطر کر سکتی ہے۔

یوں شاعر نے اپنے مجموعے میں آقاؐ کے کرم گستری کا بھی ہر ہر مقام پر ذکر کیا ہے کہ ہماری کامیابیاں آپؐ ہی کی سیرت پر عمل پیرا ہونے سے ہیں۔اُن کی ایک مختصر نعتیہ نظم ''محمد محمد کہو ساتھیو'' بڑی پُراثر ہے۔

کئی جگہ نعتیہ کلام میں خوب مضمون آفرینی کی ہے۔لکھتے ہیں کہ وہ زائرین جو آپ کے دربار میں حاضری کے لیے جا رہے ہیں انہیں سائے کی ضرورت ہے، اِس لیے اللہ کریم تو مجھے مسافروں کے راستے کا درخت بنا دے جو مسافرت میں اُن کے لیے خنک چھاؤں کا سبب بنے۔

روگ مٹ جائیں گے ایک دن سارے قتیل
حاصل اُن کے شہر کی آب وہوا ہونے کے بعد

سایۂ دامانِ شاہِ انبیاؑ جس پر ہوا
زندگی اُس نے گزاری ہے بڑے آرام سے

تھپکیاں دینے آ گیا آپؐ کا سایۂ کرم
اُن کے گنہگار سے جب کوئی بھول ہو گئی

لایا ہوں اُن کے در سے میں بھر بھر کے جھولیاں
آسودۂ نظر ہوں میں اُن کی عطا کے بعد

یارب مسافروں کو ضرورت ہے سائے کی
تو اُن کے راستے کا بنا دے شجر مجھے

چوں کہ قتیل ایک بڑے گیت نگار اور غزل گو ہیں، اُنہوں نے نعت نگاری میں تمام شعری لطافتوں کا خیال رکھا ہے۔صرف مضمون ہی نہیں باندھے۔شعر کے جمالیاتی پہلو پر بھی گہری نظر رکھی ہے۔

ذکرِ احمدؐ سے ہے یوں کرنوں کی بارش روح پر
چودھویں کا چاند جیسے جھانکتا ہو بام سے
عصیاں سے شعلہ شعلہ تھی پیشانیِ قتیل
اُس کو نداموں کا عرق آپؐ نے دیا

اُن کے جمالیاتی اظہار کا ایک خوب صورت پہلو یہ بھی ہے کہ قتیل چوں کہ ترنم اور موسیقی سے بہت شغف رکھتے تھے، اُن کی ایک عمر اُس ماحول میں بیتی تھی۔ اِس لیے اُن کی کئی نعوت کا آہنگ اور موسیقیت دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ اُن کی ایک نعت جس کی ردیف ہے ''میرے سوہنے نبیؐ میرے پیارے رسولؐ''۔ اُس کے ذکر کے بغیر بات ادھوری رہے گی۔ مذکورہ نعت میں عجز و انکسار بھی ہے اور عقیدت و محبت بھی۔ اُس میں مومن کی گدائی کی بات بھی ہے اور آقاؐ کی بادشاہی کا ذکر بھی ہے۔ آپؐ کی رحمتوں اور کرم فرمائیوں کا ذکر بھی ہے اور آدمیت کی فلاح و بہبود کے لیے آپؐ کی راہنمائی کی باتیں بھی۔

آپ کے اُن اُصولوں اور کرم گستریوں کا ذکر بھی ہے کہ ایک طرف تو آپؐ نے اُن اپنوں کو جنھوں نے خود کو آقاؐ کے قدموں کی دھول بنائے رکھا اُنھیں ذرّوں سے آفتاب کر دیا اور دوسری طرف دشمنوں کی بد کلامی کے باوجود اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے کام لیا۔ طویل بحر کی اِس نعت کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

لے کے آیا ہوں میں کچھ محبت کے پھول
میرے سوہنے نبیؐ میرے پیارے رسولؐ
چاہے بے رنگ ہیں، اِن کو کر لے قبول
میرے سوہنے نبیؐ میرے پیارے رسولؐ
تو ہے آقاؐ مرا، میں ہوں ترا گدا
کب سنے گا تو مری التجا

ہو گا کب تیری رحمت کا مجھ پر نزول
میرے سوہنے نبیؐ میرے پیارے رسولؐ

لیکن قتیل سے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ اُن کے ترقی پسندانہ نظریات اپنی جگہ پر مگر اُن کے دل کی راکھ میں عشقِ رسول کی چنگاری بہرحال ہمیشہ موجود رہی۔

اُس کا ثبوت یہ ہے کہ اُن کا نعتیہ مجموعہ ''نذرانہ'' تو ۲۰۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوا مگر ۱۹۶۴ء میں جاری ہونے والی فلم ''فرنگی'' میں نورجہاں کی آواز میں اُن کی دعائیہ رنگ نعت ''تیری ذات مظہرِ نورِ خدا'' عشقِ رسولؐ کی تابانیاں لیے ہوئے ہے۔

اِترا کے چل سکوں گا ستاروں میں ذاتِ پاکؐ
ذرّہ بنایئے کفِ پا کا مرے رسول ﷺ
(اکرم کُنجاہی)

کلیم عثمانی کی وارفتگی

اگرچہ ابتدائی طور پر کلیم عثمانی نے ۱۹۵۵ء میں کراچی میں بننے والی ایک فلم ''انتخاب'' سے گیت نگاری کا آغاز کیا مگر انہیں ۱۹۶۰ء کی ایک فلم ''ہم دونوں'' کی غزل ''اُن کی نظروں۔۔۔۔۔'' سے شہرت ملی۔ گلوکارہ ارونا لیلیٰ کو بھی اِس غزل نے امر کر دیا۔ بعدازاں اُنہوں نے بڑا آدمی، راز، دھوپ چھاؤں، جلوہ، عصمت، جوش، انتقام، نازنین، دوستی، بندگی، عندلیب، نیند ہماری خواب تمہارے، چراغ کہاں روشنی کہاں، گھرانہ، شرافت، داغ، زندگی، فرض اور مامتا جیسی فلموں کے لیے نغمے تحریر کیے۔ آخرالذکر فلم میں اُن کا لکھا ہوا قومی گیت جسے نیرہ نور اور ساتھیوں نے گایا اور روبن گھوش نے موسیقی ترتیب دی امر ہو گیا:

''اِس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں''

اُنہوں نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے بھی بے شمار قومی و ملی نغمات تحریر کیے۔ اُن کے گیتوں کو مجیب عالم، اروناؔ لیلیٰ، احمد رشدی، مسعود رانا، نور جہاں، مہدی حسن، مہناز، اے نیّر جیسے گلوگاروں نے اپنی آواز کے جادو سے مقبول بنایا۔ ملی نغمات کو شاعر ایک خاص جذبے اور کیفیت میں آ کر لکھتے ہیں۔ موسیقار نثار بزمی نے ایک واقعہ سنایا تھا:

''ایک روز فجر کے وقت کلیم عثمانی میرے گھر آئے۔ پوچھا خیریت''؟

جواب دیا ''ابھی تھوڑی دیر قبل ادھ سوئی ادھ جاگی کیفیت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قائداعظمؒ کمرے میں غصہ کی حالت میں آئے اور کہہ رہے ہیں کہ میرے ملک کا کیا خراب حال کر رکھا ہے؟ تم لوگوں نے تو مایوس ہی کیا! ہاں! اگر کسی سے اچھی امید ہے تو وہ اس ملک کے بچے ہیں۔ بس تب سے طبیعت سخت مضطرب ہے''۔

بزمی صاحب نے جواب دیا:'' قائدؒ نے کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں کہا۔ سب کو آزما کے دیکھ لیا، اب ان بچوں سے ہی کوئی امید کی جا سکتی ہے۔ بس وہ کچھ ایسا لمحہ تھا کہ بے ساختہ کلیم عثمانی کو ایک خیال سوجھا کہ ''تم ہو پاسباں اس کے''۔

بس پھر کیا تھا مکھڑا بن گیا۔ گویا بانی پاکستان اس ملک کے بچوں سے کہہ رہے ہیں: ''یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے''۔ اس طرح سے ریکارڈ وقت میں بے مثال طرز کے ساتھ یہ نغمہ مکمل ہوا۔ جس کو پاکستان ٹیلی وژن لاہور مرکز سے پروڈیوسر اختر وقار عظیم نے مہدی حسن کی آواز میں پیش کیا۔

یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے، تم ہو نغمہ خواں اس کے
اس چمن کے پھولوں پر رنگ و آب تم سے ہے
اس زمیں کا ہر ذرہ آفتاب تم سے ہے

یہ فضا تمہاری ہے، بحر و بر تمہارے ہیں
کہکشاں کے یہ اجالے، رہ گزر تمہارے ہیں
اس زمیں کی مٹی میں خون ہے شہیدوں کا
ارضِ پاک مرکز ہے قوم کی امیدوں کا
نظم و ضبط کو اپنا میرِ کارواں جانو
وقت کے اندھیروں میں اپنا آپ پہچانو
یہ زمیں مقدس ہے ماں کے پیار کی صورت
اس چمن میں تم سب ہو برگ و بار کی صورت
دیکھنا گنوانا مت، دولتِ یقیں لوگو
یہ وطن امانت ہے اور تم امیں لوگو
میرِ کارواں ہم تھے، روحِ کارواں تم ہو
ہم تو صرف عنواں تھے، اصل داستاں تم ہو
نفرتوں کے دروازے خود پہ بند ہی رکھنا
اس وطن کے پرچم کو سربلند ہی رکھنا
یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے، تم ہو نغمہ خواں اس کے

احتشام الٰہی (کلیم عثمانی) جو علامہ شبیر احمد عثمانی کے خاندان سے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں ضلع سہارن پور کے مشہور قصبے دیو بند میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے شعر کہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے بعد لاہور تشریف لائے تو احسان دانش کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ اللہ کریم نے اعلیٰ ترنم کی دولت سے بہرہ مند کیا تھا اِس لیے کل پاکستان مشاعروں میں خوب داد سمیٹتے۔
اِس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ادب کی تخلیق سے بھی غافل نہیں ہوئے۔ اُن کے کلام کا

انتخاب ''حرفِ دیوار'' کے نام سے شائع ہوا۔''ماہِ حرا'' کے نام سے نعتیہ مجموعہ بھی سامنے آیا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے سے جب فلمیں زوال پذیر ہونے لگیں تو اُنہوں نے بھی فلم نگری سے کنارہ کشی کر لی۔فلم گھرانہ اور زندگی کے گیتوں پر دوبار نگار ایوارڈ بھی ملا۔انتقال ۲۰۰۰ء لاہور میں ہوا۔کریم بلاک اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

کلیم عثمانی کا پہلا مجموعہ ''دیوارِ حرف'' ۱۹۸۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔اسی دوران آپ کو سفرِ حجاز کی سعادت نصیب ہوئی۔دل گداز میں اضافہ ہوا۔سوچوں میں ایسا انقلاب برپا ہوا کہ طبیعت نعت گوئی کی طرف مائل ہوئی۔

آپ نے نعتوں میں بھی لکھا کہ جی چاہتا ہے اب نعت کے سوا کچھ نہ لکھوں،اُس ہستی ہی کے لیے قلم صرف کر دوں کہ جس کی تعریف بیان کر کے میں خود کو بڑا کرتا ہوں اور جس کی بعثت سارے جہانوں کے لیے رحمتوں کا باعث ہے۔

اِس لیے رحمت ہے کہ آپ کا دیا ہوا نظام اور آپ کی ہر ہر سنت نہ صرف زندگی کے چراغ کا نور ہے بلکہ شعور و آگہی کا چہرہ ہے۔اِس لیے وقت کی پیشانی پر سدا آپ کا نام عظمت و تکریم سے لکھا رہے گا۔امتدادِ زمانہ اُسے ہرگز مٹا نہیں سکتا۔تیری عظمتیں لیل و نہار کی گردشوں اور ماہ و سال کی کسی بھی تشویش سے ماورا ہیں۔

اُن کی تعریف سے میں خود کو بڑا کرتا ہوں
جن کی بعثت ہے شرف سارے جہانوں کے لیے
چہرہ نمائے آگہی، نورِ چراغِ زندگی
تیرا کیا ہوا عمل، تیرا دیا ہوا نظام

آپ کا نعتیہ مجموعہ ''ماہِ حرا''، قتیل شفائی کے ''نذرانہ'' سے ۴ ماہ بعد اپریل ۲۰۰۱ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہ تقریباً ۱۵ برسوں میں کہی گئی نعوت پر مشتمل ہے۔۱۶۰ صفحات کے اِس مجموعے میں بلا کی سپردگی اور وارفتگی ہے اُس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر

تھے اور ادب کا قاری جانتا ہے کہ غزل میں حسن، شعریت، غنائیت اور تاثیر وارفتگی ہی سے آتی ہے۔

مزید براں وہ فلمی گیت نگار بھی تھے اور ایسی گیت نگاری میں بلا کی غنائیت اور موسیقیت ہوتی ہے لہذا جب وہ نعت نگاری کی طرف آئے تو اِن جذبات نے تقدیسی روپ دھار لیا۔ یوں اُن کی نعت سامع اور قاری کے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

کچھ نعتیں جو عمرے کی سعادت سے پہلے کی ہیں اُن سے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں اذنِ حضوری کے لیے تڑپ اور حسرت زیادہ ہے۔

کیا بتائیں کس طرح ہم پہنچے ہیں واپس یہاں
دل وہیں پر چھوڑ آئے جان لے کر آئے ہیں
پھر مواجہ کی حضور ی دل کو تڑپانے لگی
زندگی کو پھر سعادت کا سفر درکار ہے
اُن کا سودا جس میں ہو جو اُن کے قدموں میں رہے
میرے شوقِ بندگی کو ایسا سر درکار ہے
خاک میری جو غبارِ رہِ طیبہ ہو جائے
سر پہ جو بوجھ ہے عصیاں کا وہ ہلکا ہو جائے
نفس نفس میں ہے تیرا مسکن نظر نظر میں قیام تیرا
ہزار بدلے زمانہ لیکن دلوں کی دھڑکن ہے نام تیرا

حضور کے کئی معجزات کا ذکر تو کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی سیرت اور آپ کی سنت سے بڑا معجزہ کوئی نہیں۔ آپ کے خلقِ عظیم کا کیا کہنا کہ دشمنوں کے ساتھ بھی کرم، رحم، احسان کیا، اُن کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ طائف والے جنہوں نے حضور پر اتنے پتھر برسائے کہ سارا جسمِ اطہر لہولہان ہو گیا۔

وہ مشرکین جنہوں نے حضور اور اُن کے پیاروں کو ۳ سال مسلسل مکہ کے قریب شعبِ ابی طالب (کوہ ابوقبیس اور کوہ خندمہ کے درمیان درہ) میں اقتصادی و سماجی تعلقات منقطع کر کے محصور رکھا۔ وہ جنہوں نے حضورؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا، وہ جنہوں نے جنگ میں حضور کے دندان مبارک شہید کر دیئے، وہ جنہوں نے حضور کے پیارے چچا حضرت امیر حمزہؓ کا کلیجہ چبا ڈالا۔ فتح مکہ کے موقع پر اُن سب کو معاف فرما دیا۔ سبحان اللہ۔ دنیا کا کوئی بھی فاتح کردار کی اُس عظمت کا فائز ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لوگ جو یہ سب کچھ کرتے تھے وہ بھی آپ کو صادق اور امین کہتے تھے۔

وہ جو افلاک نشین تھے۔ اللہ کے مہمان بنے، سادہ اِس قدر تھے کہ لوگ انہیں بوریا نشین خاک نشین کہتے تھے۔ دوست ہو یا دشمن کوئی اُن کے عظیم کردار پر انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔

کلیم عثمانی بھی انہیں قبلۂ جاں قرار دیتے ہوئے، اُن ہی کے کردار سے لو پا کر درخواست گزار ہیں کہ آقاؐ میرے بھی کردار کی خامیاں درست فرما دیجیے۔ ہمارے نعت نگار شاعر کے نزدیک آپؐ نورِ مجسم بھی ہیں اور روحِ دو عالم بھی، آپ روحِ بہارِ گلشن بھی ہیں اور رحمتِ عالم اور شفقتِ دائم بھی، آپ شمعِ ہدایت اور مہرِ رسالت بھی ہیں اور رازِ محبت اور آیۂ رحمت بھی، آپ عرش کی زینت بھی ہیں اور فرش کی رفعت بھی، آپ ساقیِ کوثر بھی ہیں اور مالکِ زمزم بھی:

قبلۂ جاں مرے اعمال کا قبلہ ہو درست
دور آقاؐ مرے کردار کی خامی ہو جائے
اُس خلقِ مجسم کا بیاں کیسے ہو ممکن
پیش آتا ہو دشمن سے بھی جو خندہ جبیں سے
جب بھی ڈالوں میں ترے اسوۂ کامل پہ نظر
ہیچ نظروں میں مری دولتِ دنیا ہو جائے
قدموں میں دو عالم کی دولت پیوند قبا و چادر میں
دنیا نے یہ اپنی آنکھوں سے سامان تمہارا دیکھا ہے

اے جمالِ بزمِ ایماں، اے کمالِ آگہی
تیرے کوچے میں ملا آ کر سراغِ زندگی
تو نے سمجھایا مقامِ آرزو رمزِ طلب
زندگی کو تو نے بخشا سوز و سازِ زندگی

ہمارے ملک اور ادب کا وہ طبقہ جنہوں نے پاکستان کے قیام اور تاریخِ انسانی کی سب سے عظیم ہجرت کو آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ اپنے ذاتی دکھ سکھ کی نسبت اِس پاک وطن اور امتِ مسلمہ کے معاشی، معاشرت اور سماجی آشوب کو سب سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نظریے پر ہم سب زیادہ ایمان رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے تقسیمِ ہند کے وقت نوعِ انسان کے کرب کو دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا تھا وہ اپنے ذاتی رنج والم سے زیادہ ہر انسانی المیے پر نظر رکھتے ہیں۔ کلیم عثمانی بھی ہمارے مشاہیر میں سے ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے ہجرت کا درد محسوس کیا اور کرب سہا تھا لہذا وہ ارضِ پاک کو کسی آشوب میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ اُنہوں نے حالی کی نعت گوئی کے مکتبِ فکر کو اپنایا اور اجتماعی مسائل کو بھی اپنے نعتیہ کلام میں جگہ دی۔ نبی آخرالزماں ﷺ کی خدمت میں گزارشات پیش کیں۔ اُن سے نظرِ کرم کی استدعا کی۔ یوں اُن کے تقدیسی کلام میں عصری آگہی اور آشوب بھی کم نہیں۔ ہماری اخلاقی زوال پذیری پر یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے کہ جھوٹ کیسے سکہ رائج الوقت بن چکا ہے۔ سیاست میں تو جھوٹ ایک ڈپلومیسی ہے۔ سچے اور ایمان دار شخص کو فی زمانہ لوگ بیوقوف کہتے ہیں۔ کلیم عثمانی کا کہنا ہے کہ میرے حضور میں آپ کے دربار میں دیدۂ تر کے چراغ جلائے ہوئے بیٹھا ہوں، آپ رحمتِ عالم ہیں کرم کی ایک نگاہ فرمایئے کہ انسان زندگی میں مسائل کے تپتے سورج کے نیچے جل رہا، اُسے کسی سایۂ رحمت کی تلاش ہے، یہ کرم آپ ہی فرما سکتے ہیں کیوں کہ آپ اتنے عظیم ہیں کہ زمین پر خوشی وطمانیت کے ساری رنگ بھی آپ کی بہ دولت ہیں اور کہکشائیں بھی آپ ہی کے سفر کی گرد ہیں:

اے سجدہ گہہِ اہلِ وفا دیکھ ذرا دیکھ
تخریب کے ہر سمت نظر آتے ہیں آثار
آلودۂ عصیاں ہے جمالِ رخِ ہستی
انسان سے انسان ہے پھر بر سرِ پیکار
ہر ایک گام ہے درپیش عرصۂ محشر
حضور سایۂ رحمت کو ڈھونڈتا ہے بشر
نہیں ہے ذہنوں میں تفریقِ نیک و بد باقی
ہوئے ایک حلال و حرام کہہ دینا
کھلے ہیں چاروں طرف جھوٹ کے حسیں بازار
صداقتوں کا نہیں احترام کہہ دینا

کلیم عثمانی کے ہاں حاضری وحضوری کے حوالے سے دو پہلو نمایاں ہیں۔ایک تو ارضِ مقدس اور روضۂ رسولؐ کی جالیوں کا بوسہ لینے کی تڑپ اور دوسرا یہ کہ دربار رسول ﷺ میں حاضری کے بعد کی سچی اور کھری محسوسات۔حاضری وحضوری کی تڑپ کا تعلق دراصل حبِ رسول ﷺ سے ہے جو نعت گوئی کی شرطِ اوّلیں ہے۔

اقبال اسی عشق ومحبت کی قوت سے ہر پست کو بالا اور دہر میں اجالا کرنا چاہتے ہیں۔ حافظ لدھیانوی دل کو وقفِ غمِ محبوب اور ہر سانس کو مصروفِ ثنا رکھتے ہیں۔

اسی حب کو مظفر وارثی ہر دم روح میں تابندہ رکھ کے زندگی کا لمحہ لمحہ تابناک بناتے ہیں۔اسی محبت کی تڑپ کے نتیجے میں حفیظ تائب کی آنکھوں سے روز وشب اضطرابی و بے قراری اشکوں کی صورت رواں دواں رہتی ہے۔

اسی حبِ رسول ﷺ کی یہ دولت ماہر القادری ہر پل تصورِ جانانہ میں بیتانا چاہتے ہیں اور غفلت کا ایک لمحہ بھی معصیت میں شمار کرتے ہیں۔راجہ رشید محمود خدا کے بعد اپنا سب کچھ حضور کی

ذات کو قرار دیتے ہوئے انہیں عشق کی ابتدا بھی اور انتہا بھی کہتے ہیں۔ انہیں قلب کی آرزو اور روح کا مدعا بنائے ہوئے ہیں۔ کلیم عثمانی نے نہایت قلبی گداز کے ساتھ حضوری کے وقت کی کیفیات شعر کے سانچے میں ڈھالی ہیں:

کیسے کہوں کہ اذنِ حضوری کا شکریہ
عصیاں کا بوجھ سر پہ ہے شرم و حیا میں ہوں
کھلتی نہیں زبان کروں عرضِ حال کیا
ڈوبا ہوا تمام میں جرم و خطا میں ہوں
زہے نصیب کہ قدموں میں اُن کے بیٹھا ہوں
زمانے بھر کے لیے ہیں جو رحمتوں کا شجر
وسیلہ اُن کو بنایا ہے جب دعاؤں میں
مجھے یقیں ہے کھلے گا ضرور بابِ اثر
مدت سے ہے ارمان کہ میں صحنِ حرم کو
پلکوں سے کروں صاف کبھی اپنی جبیں سے
حبِ محمدؐ دولتِ ایماں یادِ محمدؐ نورِ دل و جاں
ذکرِ محمدؐ دافع ہر غم صلی اللہ علیہ وسلم

آپؐ کی ذات مثلِ ابرِ کرم ہے جو دکھ درد اور تکالیف کی گرد کو صاف کر دیتا ہے۔ اُن کی نظر کا فیضان ہے کہ مرجھائے ہوئے پھول کھل اٹھتے ہیں اور خار و خس لالہ و گلاب بن جاتے ہیں۔

کلیم عثمانی تو شعر گوئی کے ہُنر اور کمال کو بھی آپ کی ذات اقدس کا فیضان خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مجموعے کا آغاز مسجدِ نبوی میں کہے گئے دو اشعار کی ایک دعا سے ہو رہا ہے، جس میں شعر و سخن کے ہُنر کے لیے دوام، احترام، پذیرائی اور قبولِ عام کی دعا کی گئی ہے۔

ابرِ کرم ہے جن کی ذات، وجہء سکوں ہے جن کا نام
ان پر نثار جان و دل اُن پر درود اور سلام
ان کے نظر کے فیض سے خار بھی پھول ہو گئے
ان کے قدم سے مل گیا خاک کو عرش کا مقام

کیا کب میں نے سیرت سے مکمل استفادہ
یہ میرے ذہن کی کھڑکی ابھی تک ادھ کھلی ہے
(اکرم کُنجاہی)

مظفر وارثی کی قلبی کیفیات

کم کم ہی ایسے خوش بخت ہوتے ہیں کہ اُن کا پہلا ہی تخلیقی کام عوام وخواص میں پذیرائی حاصل کر لے۔مظفر وارثی ایسے شعرا میں شامل ہیں۔اُنہوں نے پہلی بار پاکستان کی ایک کامیاب فلم ہمراہی کے گیت لکھے اور تمام ہی گیت سپر ہٹ ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ یہ فلم بھارتی فلم دوستی سے متاثر ہوکر بنائی گئی تھی۔اِس فلم میں اُن کی لکھی ہوئی ایک نعت بھی شامل تھی جسے بعض محقق خالد محمود خالد نقش بندی کی نعت کہتے ہیں۔یہ ممکن نہیں ہے کہ مظفر وارثی جیسا عظیم نعت نگار جس نے ہمراہی کے تمام گیت لکھے وہ فلم میں شامل واحد نعت تحریر نہ کرتا۔وکیپیڈیا نے بھی یہ نعت اُن ہی سے منسوب کی ہے۔نعت یہ ہے:

کرم کی اک نظر ہم پر خدارا یا رسول اللہ ﷺ

بھارت میں ''دوستی'' اُس کے گیت ترقی پسند شاعر مجروح سلطان پوری نے تحریر کیے تھے۔دونوں فلمیں کامیاب ہوئی اور دونوں ہی کے گیت بے حد مقبول۔مظفر وارثی نے بہت ہی

کم وقت فلمی دنیا میں گزارا مگر اُس مختصر وقت میں کوئی ڈیڑھ درجن فلموں کے گیت لکھے جو زیادہ تر مقبول ہوئے۔

وہ اُس ماحول سے اکتا گئے اور عشق رسول ﷺ نے انہیں اپنی گرفت میں اس طرح لیا کہ وہ حمد و نعت ہی کہنے لگے۔ اللہ کریم نے لحنِ داؤدی سے نوازا تھا اس لیے مشاعروں کے بھی بہت کامیاب شاعر قرار پائے اور پوری دنیا میں مشاعرے پڑھے۔ ہمارے قریب کے عہد میں شاید کلیم عثمانی اور اعجاز رحمانی ہی اتنا خوب صورت پڑھتے تھے۔ جنگ ستمبر میں پاک فضائیہ کے عالمی شہرت یافتہ غازی مجاہد، ایم ایم عالم کو مشہور مظفؔر وارثی نے خراج تحسین پیش کیا: ''ناز ہے پاکستان کو تجھ پہ اے مشرق کے لال۔'' اس کو گانے کا اعزاز احمد رشدی کے پاس ہے۔

مظفر وارثی ۱۹۳۳ء میں میرٹھ (متحدہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد صوفی وارثی بھی اپنے زمانے کے عالم، ادیب اور شاعر تھے۔ اُنہوں نے کلام میں اصلاح اپنے والد ہی سے لی۔ ۲۰۱۱ء لاہور میں اپنے چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ اُن کی اہم تخلیقات میں برف کی ناؤ، بابِ حرم، لہجہ، نورِ ازل، الحمد، حصار، لہو کی ہریالی، ستاروں کی آبجو، کعبۂ عشق، کھلے دریچے بند ہوا، دل سے درِ نبی ﷺ تک، ظلم نہ سہنا، کمند شامل ہیں۔ وہ ایک بہادر اور نڈر انسان تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے ڈاکٹر طاہر القادری کی جماعت میں بھی شامل رہے اور اُن کے جلسوں میں اپنے کلام سے عوام کا لہو گرماتے رہے۔

نعت نگاری حضور ﷺ کی عقیدت ہی نہیں عشق و محبت کا معاملہ ہے۔ یہ صنفِ ادب قلم اور زبان کو حق اور سچ سے آشنا کر دیتی ہے۔ نعت نگاری کی تابانیوں سے عہدِ رفتہ اور عصرِ رواں روشن و رخشاں ہے اور آئندہ دور بھی اجلا اجلا رہے گا۔ نعتیہ ادب کا عمیق مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر نعت گو پہلے اپنی کم مائیگی کا اظہار کرتا ہے۔ بعد ازاں شاہِ انس و جاں کی خدمت میں فکرِ رسا اور لفظیات کے مخزن کے لیے التجا کرتا ہے کیوں کہ نعت اُن کی عنایت اور عطا کا معاملہ ہے۔

مظفر وارثی بھی چوں کہ عشاق کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدا میں غزل بھی کہتے

تھے بلکہ فلمی نغمات بھی تحریر کرتے تھے مگر جب عشقِ رسول ﷺ کا سوز و گداز اور تڑپ دل میں سما گئی تو خود کو نعت کے لیے وقف کر دیا۔ اُن کے چند اشعار پر نظر ڈالیے جن میں وہ ایک طرف تو نعت کے حوالے سے آپؐ کی اسلوبیاتی عطا کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایک خوب صورت ترکیب کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ اللہ کے حبیب نے لفظیات کا خزانہ میرے ذہن کی تھالی میں ڈال دیا۔

چوں کہ اللہ پاک اور اُس کے فرشتے درود و سلام کی صورت میں حضورؐ کی نعت پڑھتے ہیں، لہذا مظفر وارثی نے جب درود و سلام پڑھا، ذکر و ثنا کی وادی میں مقیم ہوئے اور لکھنا شروع کیا تو نعت کی خدائے ہست و بود نے بھی داد دی۔

لکھنے چلا جو نعت تو میرے حضورؐ نے
لفظوں کا ڈھیر ذہن کی تھالی میں رکھ دیا
سخن کی داد خدا وے وصول کرتی ہے
زبان آج ثنائے رسولؐ کرتی ہے
رسیا درود کے، متمنی دعا کے ہیں
ہم رہنے والے وادیٔ ذکر و ثنا کے ہیں
نہ مرے سخن کو سخن کہو ، نہ مری نوا کو نوا کہو
مری جاں کو صحنِ حرم کہو، مرے دل کو غارِ حرا کہو

پیارے نبیؐ وہ ہیں کہ جب تاریکی حد سے بڑھی تو وہ صبح کے تارے کی طرح نمودار ہوئے۔ جب سوچوں اور امیدوں کی کھیتیاں سوکھ چکی تھیں تو وہ ابرِ کرم کی طرح ہر طرف نیلگوں آسمان پر پھیل گئے۔

ہر سمت سراب ہی سراب تھے، کہیں ساحل نہیں تھا۔ گمان اور اوہام تھے، حقیقت سات پردوں میں نہاں تھی۔ اہلِ عالم منتظر تھے، افضل البشرؐ کے، جو انہیں حقیقت اور صداقت کی دنیا میں لے کر آئے۔ نبی اللہؐ کا سب سے بڑا احسان تو یہ تھا کہ اللہ پاک نے انسان کو دل دیا مگر پیارے

نبیؐ نے اِس کفر و شرک میں مبتلا دل کو خدائے یکتا سے آشنا کیا۔ انسان کو ذاتِ حق کی پہچان کروائی۔ اُسے ایک سجدے کا درس دیا، وہ ایک سجدہ کہ جس نے انسان کو اصنام کے سامنے ہزار بار جبینِ ناز کا تقدس لٹانے سے بچا لیا اور پھر آپ حرا سے جب سوئے قوم تشریف لائے تو ایک ایسا نسخۂ کیمیا ساتھ لائے جو ایک عظیم تر تہذیب کی نمود کے لیے مکمل ضابطۂ حیات تھا۔ ایک ایسا قانونِ فطرت جس نے ایک نئی زندگی کے لیے انسان کو بہترین اصول فراہم کیے۔ پرانے انسان کی داخلی کیفیات میں انقلاب برپا کر کے، آپؐ نے گویا اُسے نیا انسان بنا دیا، ایک ایسا انسان جس نے ظلم وستم کی بستی میں حرم کا راستہ اختیار کیا۔ مظفر ایک تلمیح کا استعمال کرتے ہیں کہ حضورؐ نے اُسے ایک ایسا عصا دیا جس نے اُس کے اندر کے اژدھے نگل لیے۔ اُس کی زندگی کا مفہوم ہی بدل گیا۔

مظفر وارثی ایک فرد نہیں ایک انسان کی حیثیت سے اپنی ذات پر پیارے نبیؐ کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں۔ بات تو وہ واحد متکلم کی حیثیت سے کر رہے ہیں مگر یہ تمام مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ کہتے ہیں کہ میری ہر رگ سے نور اجالا پھوٹ رہا ہے اس لیے کہ میں نے آپ کا سایہ اوڑھ رکھا ہے۔

بظاہر حضورؐ کا سایہ نہیں تھا مگر جہاں بھر پر آپؐ کے کرم اور آپ کی رحمت کا سایہ ہے جو زمانوں کی پابندی سے آزاد ہے۔ کہتے ہیں، میں وہ خوش بخت ہوں کہ جس کے چراغوں کو ہوائیں اپنی پناہ میں لیے لیے پھرتی ہیں۔

ہوائیں مجھ پر رشک کرتی ہیں۔ اِس مفہوم پر بھی اُن کے کلام میں کئی اشعار ملتے ہیں کہ جو شخص بھی اُن کی طرف بڑھا، آپ کا ہو گیا پھر ہوائیں اُس کے چراغوں کی حفاظت پر مقرر ہو جاتی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ میری حیثیت ہی کیا ہے۔ یہ تو آپؐ کی عنایات ہیں ورنہ تو ماہتاب بھی آپ کا مشتاق ہے اور بادل آپ کے کرم نوازیوں سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں۔

بخت سیاہ جب درِ عالی پہ رکھ دیا
سورج اُنھوں نے دستِ سوالی پہ رکھ دیا

مانگے تھے میں نے آپ ؐ سے رحمت کے چند پھول
سارا چمن دعاؤں کی ڈالی پہ رکھ دیا
مری حیات ہے مقروض اُس کی رحمت کی
ہر ایک سانس مرا ، اُس کے نام ، اُس کے لیے
اک بوریا نشین نے بانٹی حکومتیں
سیراب کر گیا ہمیں صحرائے مصطفےٰؐ
کیوں نہ پھوٹے مری رگ رگ سے اجالا تیرا
اوڑھ رکھا ہے مرے جسم نے سایا تیرا
رشک کرتی ہیں زمانے کی ہوائیں مجھ پر
میری شمعوں کو لیے پھرتا ہے جھونکا تیرا
زندگی اُس کی ہواؤں میں دیے لے کر چلی
جو بڑھا اُن کی طرف ، جو ہم سفر اُن کا ہوا

ہمارے تقدیسی ادب میں مدینہ دراصل ایک علامت ہے، عشق ومحبت اور انتہائے عقیدت کی، جذب وکیف اور جنون وسرشار کی، عظمتِ ماضی کی، سچائی اور صداقت شعاری کی، توبہ اور استغفار کے در کی، ہر دکھ درد کے مطب کی، سچی رہبری ورہنمائی کی، تہذیبِ انسانی کی پہلی عظیم درس گاہ کی، ایک نئے معاشرے کی تشکیل کی، قلب و ذہن اور ضمیروں کی بیداری کی، حق پرستی وحق شناسی کی ابتدا کی، جہالت کے خاتمے اور علم وحکمت کی ابتدا کی۔ انسان سازی کی تربیت گاہ کی۔مظفر وارثی مرحوم کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے جو ذاتی طور پر بھی میرا انتخاب ہے۔ اِس کی معنویت میں ایک طرف تو امت کی اجتماعی حالت پر کرب کا اظہار ہے کہ ہماری جو حالت ہو چکی ہے۔یقیناً اُس کا سبب یہ ہے کہ حضور ﷺ ہمارے اعمال وکردار کی وجہ سے ہم سے ناراض ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اب اِس بیماری کا علاج بھی صرف مدینہ منورہ کے مطب میں ہے۔

اِس لیے مسلمانوں کی بھٹکی ہوئی اور بے چین و بے قرار زندگی سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ مدینہ شریف سے ''جھونکے ہوا کے لا'' یہ تازہ ہوا کے جھونکے کیا ہیں؟ یہ حقیقت میں اُسوۂ رسول ﷺ ہے۔

عہدِ نبوی کا چال چلن اور کردار ہے۔ اُس پاکیزہ عہد کی سچی اور کھری زندگی ہے۔ جھوٹ اور کذب کی کثافتوں سے پاک۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ ہمیں اپنا طرزِ زندگی، رسولِ خدا کی سنن اور احادیث کی روشنی میں بہتر بنانا ہوگا۔ اسی نعت میں وہ رسولؐ کی امت کی حالت پر دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے عشق و وفا کی روشنی میں چہرۂ باطن سنوارنے کی بات کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں پر دنیا تنگ ہو جانے کی بات کرتے اور کہتے ہیں کہ فاروقؓ کے زمانے کی نقشے تو مدینہ سے اٹھا کے لاؤ۔

پھر وہ شرم و حیا سے محروم معاشرے میں حضرت عثمان غنیؓ کی حیا کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہم جو ہر اعتبار سے مغرب سے مرعوب ہوئے جا رہے ہیں تو شاعر ہمیں حضرت علی حیدر کرارؓ کے علم و فضل سے آگاہ کرتے اور اُن سے استفادہ کرنے کا کہتے ہیں۔ آج ہر طرف باطل کی یلغار ہے، وہ حق پر حاوی آتا جا رہا ہے۔ وہ شہیدِ کربلاؓ کے عزم و استقلال کی یاد دلاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ ہوں، اصحابِ رسولؐ ہوں یا اہلِ بیت اطہارؓ میں اخلاقِ کریمانہ ہوں، علم و حکمت ہو یا بہادری، شجاعت اور عزم و استقلال سب میرے حضورؐ کی بہترین تربیت کا نتیجہ تھا۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے کلام میں بار بار خاکِ مدینہ کو اپنی آنکھ کا سرمہ بنانے کی بات کی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مظفر وارثی کی مکمل نعت یہاں درج کروں:

جا زندگی مدینے سے جھونکے ہوا کے لا
شاید حضورؐ ہم سے خفا ہیں منا کے لا
کچھ ہم بھی اپنا چہرۂ باطن سنوار لیں
بوبکرؓ سے کچھ آئینے عشق و وفا کے لا

دنیا بہت ہی تنگ مسلماں پہ ہو گئی
فاروقؓ کے زمانے کا نقشہ اٹھا کے لا
محروم کر دیا ہمیں جن سے نگاہ نے
عثمان سے وہ زاویے شرم و حیا کے لا
مغرب میں مارا مارا نہ پھر اے گدائے علم
دروازۂ علیؓ سے خیرات جا کے لا
باطل سے دب رہی ہے پھر امت رسولؐ کی
منظر ذرا حسینؓ سے کچھ کربلا کے لا
کس منہ سے پیش ہو گا مظفر حضورِ حقؐ
اِس کو شہیدِ اُسوۂ آقا ﷺ بنا کے لا

اُن کے نعتیہ کلام میں ذکرِ صحابہؓ خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا حوالہ بہت ملتا ہے۔ کئی تلمیحات کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ نعت کی حقیقی تعریف بھی یہی ہے کہ نبی ﷺ کی ذات سے منسوب تمام اشیا، مقامات، واقعات، غزوات اور شخصیات وغیرہ کا توصیفی انداز میں ذکر بھی نعت ہی میں شمار ہوتا ہے۔ یوں مظفر کے کلام میں منقبتِ صحابہ اور اہلِ بیت طہار بھی خوب ملتی ہے۔ خلیفۂ اوّل سے متعلق کئی واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ سمجھ دار، عاقل و بالغ مردوں میں حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں میں اولیت کے درجے پر متمکن ہیں۔ معراج کے واقعہ کی بھی آپؓ نے سب سے پہلے تصدیق کی۔

ہجرتِ مدینہ کے وقت آپ ہی شاہِ دوسرا کے ساتھ غارِ ثور میں بھی مقیم رہے۔ آپ نے غزوۂ بدر میں بڑھ چڑھ کر عملی جہاد میں حصہ لیا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بے سروسامانی تھی اور حضور ﷺ نے مسلمانوں سے مالی تعاون کے لیے کہا تو حکم کی تعمیل میں حضرتِ ابوبکر اپنے گھر کا سارا سامان اٹھا لائے۔ جب حضورؐ نے پوچھا کہ صدیقؓ گھر والوں کے لیے بھی کچھ چھوڑا؟ تو

عرض کی اللہ اور اُس کے حبیبؐ کا نام چھوڑ آیا ہوں۔ علامہ اقبال نے بھی اِس واقعہ کو یوں نظم کیا تھا:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس
(اقبال)

رسول اللہ کے دنیا سے پردہ کرنے کے بعد وقتی طور پر ایک مسئلے نے سر اٹھالیا کہ حضورؐ کا نائب کون ہوگا۔ اُس موقع پر مسلمانوں کا آپؓ ہی کی ہستی پر اتفاق ہوا۔ صدیقؓ کتنے خوش بخت ہیں کہ گنبدِ خضریٰ میں بھی آپ کا ساتھ نصیب ہوا۔ اُن کے کلام میں دیگر خلفا کا بھی ذکر بڑے عمدہ اسلوب میں ملتا ہے کہ وہ نیکی، اچھائی اور قربانی کی بہترین مثال تھے۔

جب آپؓ کو شہید کیا گیا تو آپ کے دروازے پر حفاظتی پہرہ دینے والوں میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بھی شامل تھے۔ تاریخِ اسلام جانتی ہے کہ باغِ نبیؐ میں کیسے کیسے پھول کھلے تھے۔ صدیقؓ تھے، عمرؓ تھے، عثمانؓ تھے، علیؓ تھے۔ محبانِ رسولؐ سچ کہتے ہیں کہ زمانہ آپ ﷺ کی کیا مثال لائے گا پہلے حضورؐ کے غلاموں کی کوئی مثال تو سامنے لائیں۔ آپ کی مجلسِ شوری کن شہابوں سے روشن تھی۔ آپؐ چرخِ پیر پر ضوفشاں خورشید انور کی طرح اور آپؐ کے اصحابؓ مانندِ نجوم درخشاں تھے۔

سبحان اللہ کیسی سرافرازی و بلندی اصحابِ رسولؐ کو حاصل تھی۔ جن کا امتی ہونا بڑے اعزاز کی بات ہے اُن کے اصحابؓ میں شامل ہستیاں کتنی مقدر والی تھیں۔ جو بھی آقاؐ کے در تک آیا، اُس نے آپؐ کے سرچشمۂ فیضان سے علم و حکمت کی پیاس بجھائی۔ مدینہ اُس عہد میں رشد و ہدایت کا مرکز بن چکا تھا اور نبیؐ کے تمام ساتھی گُلِ بستانِ طیبہ تھے۔ راجہ رشید محمود نے اصحابِ رسول ﷺ کے مناقب کو بھی نعت نگاری ہی میں شمار کیا ہے:

اصحابِ مصطفیؐ کے مناقب لکھے
مدحِ نبی کا ہے یہ قرینہ، خدا گواہ

مظفر وارثی کے ہاں اصحابِ رسولؐ میں سے حضرت صدیق اکبرؓ کی ذات پر زیادہ مناقب ملتے ہیں۔ ویسے اُنہوں نے خلفائے راشدین، اہلِ بیت اطہار اور شہدائے کربلاؓ کے مناقب بھی بیان کیے ہیں۔ اُنہوں نے بحرِ نبیؐ کے سارے گہر ہائے تابدار کوئی مناقب میں خراجِ احساس پیش کیا ہے۔ اک ایک کا اوجِ مقدر بیان کرنا شروع کریں تو کتب کے ذخیرے اکٹھے ہو جائیں۔

اُس دور میں مدینہ کی معاشرت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ سرزمین کہکشاں کی حریف بن چکی تھی۔ جس میں اصحابِ رسولؐ جلوہ ریز نجوم کی طرح تھے۔ وہ سب جلال و جمال کا پیکر تھے۔

کوئی صدق میں اعلیٰ، کوئی حلم میں بے مثال، کوئی حسن و جمال میں لا ثانی، کوئی زورِ بازو میں لاجواب، کوئی عدل وانصاف کا مظہر، کوئی فقر کی اعلیٰ ترین مثال، کوئی غنا سے مالا مال، کوئی ایثار و وفا کا نمونہ، کوئی عشقِ مصطفےٰؐ کی رواں دواں تصویر، کوئی رنگِ شجاعت میں سب سے جدا، کوئی علم وحکمت کا روشن مینار۔ یوں کہیے کہ سب شہیدانِ اُسوۂ آقا نام دار تھےؐ۔ مظفر وارثی نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے جو مناقب بیان کیے ہیں، اُن میں سے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جس کے لہجے میں سنی ہم نے خدا کی آواز
اُس بے بوبکرؓ کو بخشا خطابِ صدیقؓ
بے زباں ہو گئی تاریخ قیامت تک کی
نہ جوابِ شہِ بطحا ﷺ نہ جوابِ صدیقؓ

ہے صراطِ استقامت کی طرح تیرا وجود
نیکی و ایثار کے مابین، عثمانِ غنیؓ
کربلا سے جا ملا، تیرے لہو کا سلسلہ
تیرے دربانوں میں تھے حسنینؓ ، عثمانِ غنیؓ

چن لیا بعدِ نبیؐ پہلا خلیفہ آپؓ کو
آپؓ کا رشتہ نبیؐ کے نقشِ پا کے ساتھ ہے
موت کی منزل نے بھی تنہا نہیں چھوڑا اُسے
وقت کا بچھڑا ہوا لمحہ بقا کے ساتھ ہے

عشقِ رسولؐ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان خاص طور پر مسلمان نعت گو حضورؐ کے پیارے شہر ''مدینہ منورۃ، گنبدِ خضری اور روضے کی جالیوں'' کے حوالے سے بھی بڑے فکر انگیز اشعار کہتے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ سامنے روضے کی جالیاں ہیں اور میری دعائیں خود بہ خود پُراثر ہوئی جا رہی ہیں کوئی کہتا ہے کہ عجب انداز کی ہے بہارِ مدینہ کہ جنت اُس پر قربان کی جاسکتی ہے، کوئی کہتا ہے شہرِ نبوت کے جلوے اِس طرح مری آنکھوں میں بس گئے ہیں جیسے پیشِ نگاہِ شوق جنت ہی کی روشنی ہے۔

کئی مدینہ شریف کی عظمت کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ چوں کہ مدینہ میں آقاﷺ کا آستاں ہے اِس لیے آسمان بھی عقیدت کے سجدے لٹاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے جمالِ قدسیاں در اصل طیبہ کی حسین فضا کا پرتو ہے۔ کوئی مدینے کے تقدس کو یوں بیان کرتا ہے کہ مدینہ کے سفر میں مجھے جو ذرّے ملے، میں نے انہیں آنکھوں میں سجالیا۔

اب چند اشعار مظفر وارثی مرحوم کے نعتیہ کلام سے ملاحظہ کیجیے جن میں وہ کہتے ہیں کہ میرے قدموں سے اِس لیے ماہتاب جیسی چمک اس لیے پھوٹ رہی ہے کہ میں سیّد الثقلین کی چوکھٹ پر کھڑا ہوں۔ پھر وہ حاضری اور واپسی کے بعد کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ میری آنکھیں تو وہیں روضے کی جالیوں کے آس پاس ہی رہ گئی ہیں کہ واپس آنے کے بعد بھی میں اُن ہی منظروں میں کھویا رہتا ہوں۔ میں بھی کچھ راتیں مدینہ میں قیام کر کے آیا ہوں۔ اب روشنی میری اندر سے نہیں جاتی۔

قدموں سے پھوٹتی ہے چمک ماہتاب کی
دہلیز پر کھڑا ہوں رسالت مآب کی
آنکھیں بکھیر آیا ہوں روضے کے آس پاس
لیکن خیال روضے کی جالی پہ رکھ دیا
ہے چہرۂ رسولؐ نگاہوں کے سامنے
تفسیر پڑھ رہا ہوں میں ام الکتاب کی
جب زباں رحمتِ عالم کی ثنا کرتی ہے
روح اُس وقت مدینے میں پھرا کرتی ہے
کچھ شبیں میں بھی مدینے میں گزار آیا ہوں
روشنی سی مرے اندر بھی رہا کرتی ہے

مظفر وارثی کہتے ہیں کہ میں تو اُس کی ہستی کے عشق میں جذب و کیف کی حد تک مبتلا ہوں، میرے لبوں سے جو آپ کے نام کا رشتہ ہے وہ اُس تعلق سے کہیں بڑھ کر ہے جو کرنوں کا آفتاب اور خوشبو کا چمن سے ہوتا ہے۔

مہتاب سے کرنوں کا ، نہ خوشبو سے گلوں کا
جو ربط ترے نام سے ہے میرے لبوں کا

میں تو آپؐ کی زیارت پسِ دیوارِ عدم بھی کر رہا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ میری سانسوں کی آمد و رفت کی آواز آپ کے قدموں کی چاپ میں ضم ہوگئی ہے۔ جب سے میں نے اپنے تاریک دل میں محبت سے اُن کا گھر بنایا ہے تو اندھیرے میرے اِس گھر کی منڈیروں پر خود چراغ جلاتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اب تو میرا اپنا کوئی چہرہ ہے نہ وجود، اب تو لوگ مجھے آپؐ ہی کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ کوئی میری آپؐ سے محبت کا اندازہ کیسے کر سکتا ہے جب کہ میں تو آپؐ کے

چاہنے والوں سے بھی ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں۔ وہ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میری آنکھوں میں جمالِ مصطفےٰ اُتر آتا ہے تو فرشتے بھی میرے اشکوں کی زیارت کو اُترتے ہیں۔

وہ عشقِ محمدؐ میں ڈوب کر کنارے تلاش کرنے والوں میں سے ہیں، وہ آپ حضورﷺ کی کملی اٹھا کر اور آپؐ کی خاکِ پا پتلیوں پر اٹھا کر چلنے والوں میں سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں تو کچھ بھی نہیں۔ ایک حقیر اور معمولی انسان ہوں مگر اُن کی فہرست میں شامل ہوں، اِس لیے میں بھی اب معمولی نہیں رہا۔ میں بظاہر ریزہ ریزہ شیشہ ہوں مگر دستِ رسول پاکﷺ میں سلامت ہوں۔ میرا آپ سے وہی تعلق ہے جو زمین کا آسمان سے ہے۔ میں جس قدر بھی آپؐ کی غلامی پر ناز کروں وہ کم ہے کہ میرے لیے اِس تاج سے بڑھ کر فخر کا اور کوئی تاج نہیں۔ میں تو اللہ کریم کو بھی آپؐ کا واسطہ دے دوں تو دعا اِدھر اُدھر نہیں بھٹکے گی۔ باریاب ہوگی۔ کہتے ہیں کہ میرا تو ایک نام خاک پائے مصطفےؐ بھی ہے:

آنکھیں ملا کے مجھ سے بات نہ کر اے آفتاب
میں ذرّہِ دیارِ رسالت ماب ہوں
وہ خاک پر چلیں تو ہوں اُن کا نقشِ پا
اور شہسوار ہوں تو اُن کی رکاب ہوں
خاکِ پائے مصطفےﷺ بھی ایک میرانام ہے
جو زمیں سے آسماں کو ہے ، وہ نسبت بھی تو ہوں
ریزہ ریزہ ہے بظاہر شیشۂ ہستی مرا
دستِ سرکارِ دو عالمﷺ میں سلامت بھی تو ہوں

اب جنابِ مظفر وارثی کی مختلف نعوت سے اِس موضوع پر مزید نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ اُن کی کئی نعوت اول و آخر عشقِ رسولؐ کی کیفیات میں ڈوبی ہوئی ہیں:

دیکھا ہے میں نے عشقِ محمدؐ میں ڈوب کر
اِس بحر کی تہوں میں کنارے بقا کے ہیں

میرا دل مصطفےؐ، میرا غم مصطفےؐ، میرا سب کچھ خدا کی قسم مصطفےؐ
قبر کے واسطے، حشر کے واسطے، چاہیے جتنا رختِ سفر لے لیا

محبت اُس کی ٹھہر تو گئی مرے دل میں
مگر یہ دل بھی ہے کمتر مقام اُس کے لیے

میں اُن میں فنا ہو کے انہیں دیکھ رہا ہوں
وہ زندہ سلامت، پسِ دیوارِ عدم ہیں

آنکھیں بھی انہیں دیکھتی رہتی ہیں مظفر
سانسیں بھی انہی قدموں کی آواز میں ضم ہیں

مریخ و ماہتاب ہیں دنیا کی منزلیں
میرا عروج، گنبدِ خضرائے مصطفےؐ

کون کہتا ہے آقاؐ مدینے میں ہیں
میری آنکھوں میں ہیں میرے سینے میں ہیں

جمالِ مصطفے سے منسلک ہوتی ہیں جب آنکھیں
فرشتے میرے اشکوں کی زیارت کرنے آتے ہیں

محبت کا تری جو میں نے دل میں گھر بنایا ہے
چراغ اُس کی منڈیروں پر اندھیرے خود جلاتے ہیں

مظفر وارثی نے حضور کو مختلف اشعار میں انتخابِ کبریا، پیش لفظِ آب وگل، دیباچۂ شام وسحر، پیغمبرِ دیں، ہادیٔ کل، رحمتِ یزداں، قبلۂ دل، کعبۂ جاں، منبرِ ایماں لکھا ہے۔ تمام کائنات آپؐ کے مقام ومرتبے کی معترف ہے۔ آپ کے عروج، سربلندی اور مقام کی اور کیا دلیل ہوگی کہ

آپؐ کے قدموں کو اُس عرشِ معلیٰ نے چوما جہاں ہمارے عقل و شعور کی بھی رسائی نہیں ہے۔ مظفر وارثی لکھتے ہیں کہ آپؐ کی رسالت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔

مظفر نے اِس مضمون کو ادا کرنے کے لیے ((محرابِ ازل'' میں جلوہ گر ترکیب خوب استعمال کی ہے۔ ماہ و سال نہیں صدیاں آپ کی کنیزیں ہیں۔ جس طرح اللہ کریم ایک ہے، احد و یکتا ہے۔ اُسی طرح ہمارے محمدﷺ بھی ایک ہیں، مزید برآں تمام انبیاؑ کی خوبیاں آپؐ کی ذات میں جمع ہیں۔ آپ انتہائے جامعت ہیں۔ آپؐ کی رضا اللہ ہی کی رضا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ وہ اللہ کی ساری باتیں تھیں جو حضورﷺ اپنی زبان سے بیان کر رہے تھے گویا خدا ہی کے ترجمان بن کر پیارے رسولؐ تشریف لائے تھے۔

اللہ نے خود تو آکر انسان کو اپنی صفات سے آگاہ نہیں کیا۔ نوعِ بشر نے اپنے خالق و معبود کو پہچانا اور جانا تو محمد مصطفےٰ کی وساطت سے۔ وہ جن کے فقر کے قدموں میں دونوں جہانوں کی بادشاہی تھی، اُن کا ہر ہر اشارہ گویا قانونِ الٰہی کا درجہ رکھتا تھا۔ مظفر وارثی کی شاعری کا یہ ایک اہم موضوع ہے کہ محمدِ عربیؐ کی ہر سانس میں رب کی شریعت ہے۔

اطاعتِ شہِ بطحا، رب ہی کی اطاعت ہے۔ اُمّی رسولؐ کی ہر بات صحیفے کا درجہ رکھتی ہے اس لیے کہ زبان محمدﷺ کی تھی مگر الفاظ خدا تعالیٰ کے تھے۔ آپؐ ایسے امّی لقب تھے کہ جس نے نصابِ عالم ترتیب دیا۔ یقیناً آنے والے ہر دور میں وہ تنہا عالمِ انسانیت کے رہبر و رہنما کہلائیں گے، تاریخ اُس کا استقبال کرے گی، جو دل اُس کے دیئے ہوئے اصول اور ضابطے پر عمل کریں گے، جہاں بانی وہی کریں گے۔

یہ مقام کتنا اعلیٰ و ارفع ہے، سبحان اللہ۔ دورِ جہالت میں عرب معاشرے کا انسان کتنا شقی القلب تھا کہ بیٹیوں کو گڑھا کھود کو زندہ دفن کر دیا کرتا تھا۔ الحفیظ الاماں۔ محسنِ انسانیت نے اُن پتھر دل انسانوں کو پانی کر دیا کہ بیٹی کی ولادت کو رحمت قرار دینے لگ گئے۔

مندرجہ ذیل ''کرنے آئے تھے'' ردیف والے تمام اشعار میں ظہور، قدسی کے بعد

آپؐ کی احسانات پر مبنی ہیں:

جس کی خوشبو ازل سے ابد تک گئی
اُس گلستانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

درود اُس کے لیے ہے سلام اُس کے لیے
خدا کے بعد تمام احترام اُس کے لیے

قدموں میں ترے فقر کے ، کونین کی شاہی
ہر ایک اشارہ ترا قانونِ الٰہی

ہر ایک سانس میں اُس کے شریعت رب کی
اطاعت ِ شہِ بطحا ، اطاعت ِرب ہے

خدا کی بات بات اپنی زبانی کرنے آئے تھے
محمدؐ اپنے رب کی ترجمانی کرنے آئے تھے

انہیں روحوں کر ذہنوں کو دلوں کو فتح کرنا تھا
وہ پتھر جیسے انسانوں کو پانی کرنے آئے تھے

تیرے قدموں میں لپٹنے میں ہے معراج مری
تیری دہلیز پہ جبریلؑ کو بیٹھا دیکھوں

بعد از حمدو ثنائے ذوالجلال
لائقِ کل مدح و مدحت آپؐ ہیں

وقت کے لب پر قصیدہ آپؐ کا ہے
حرفِ کُن کی مقصدیت آپؐ ہیں

آپؐ محرابِ ازل میں جلوہ گر
صاحبِ ختم نبوت آپؐ ہیں

نہ تھی محدود اپنے عہد تک پیغمبری اُن کی
ازل سے تا ابد وہ حکم رانی کرنے آئے تھے
تمنائے شہادت بھی رچا دی خونِ امت میں
اجل کو بھی شریکِ زندگانی کرنے آئے تھے

حدیں آفاق کی، آپؐ کے بام و درچاند سورج، چراغِ حرم آپؐ کے معراج کا معجزہ انسانی عقل و شعور کے لیے چشم کشا ہے۔ وہ فاصلہ جو زمین تا عرش کئی صدیوں کا تھا۔ آپؐ کی ایک ہی جست نے تمام طے کرلیا۔

بشر کی اوج و رفعت پر فطرت کے نظارے بھی حیرت زدہ تھے۔ بشر کو وہ عزت اور تکریم دی گئی کہ کائنات کی سربلندیاں اُس کے سامنے سرنگوں نظر آئیں۔ راسخ عرفانی کہتے ہیں کہ ہم بشر ایک جگنو سے زیادہ اہمیت کے حامل نہ تھے لیکن حضور پاک ﷺ کے قدم سرِ عرش پہنچے تو ہم ستارے ہوئے۔ بشر کے مقدر کا ستارہ جاگ اٹھا۔ وہ ایسی رفعت تھی جو خیال و فکر سے بھی ماورا ہے۔

ایسی سرافرازی کہ کہکشائیں بھی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے ملیں۔ ایسی رفعت کہ جبریلِ امینؑ سدرۃ المنتہیٰ تک جا سکے، تمام پیغمبر دیکھتے رہے اور آپ عرش تک جا پہنچے۔ وسعتِ آسمان سمٹ کے آپ کے قدموں میں آ گئی۔

مظفر وارثی مرحوم نے واقعہ معراج بہت سے اشعار میں بیان کیا ہے۔ اُن کی کئی غزلیہ ہئیت میں کہی گئی نعوت میں بھی تمام اشعار اسی موضوع پر ہیں۔

کہتے ہیں آپؐ کی رفتار وقت کی حدود و قیود سے باہر تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آپؐ معراج کے سفر پر چلے تو وقت کی رفتار تھم گئی تھی۔ زمین نے بلندیوں پر ایسے کمندیں اچھالیں کہ بشر کی رسائی دیکھ کر کہ فاصلوں کی جبیں خم ہوگئی۔

یہ رات تمام راتوں سے افضل کیوں نہ ہو کہ اندھیرے بھی ہاتھوں میں چراغ لے کر

استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ اِس لیے کہ انہیں احساس تھا کہ کسی بھی نبیؑ کو پہلے یہ رتبہ نصیب نہیں ہوا،

پابندِ روزوشب نہ تھی معراجِ مصطفےٰ ﷺ
جب وہ چلے تو وقت کی رفتار رک گئی
پرچم تھے نقشِ پا کے ستاروں کے ہاتھ میں
گزری جو کہکشاں سے سواری رسول ﷺ کی
میری بینائیوں کے پر سے نکل آتے ہیں
جب خلاؤں میں ترا نقشِ کفِ پا دیکھوں
وہ رات جس کا زمانہ جواب لا نہ سکے
ملائے آنکھ تو سورج بھی تاب لا نہ سکے
ہے خم، رسائیِ انساں پہ فاصلوں کی جبیں
بلندیوں پہ کمندیں اچھالتی ہے زمیں
یہ رات کیوں نہ ہوافضل تمام راتوں میں
لیے ہوئے ہیں اندھیرے ، چراغ ہاتھوں میں
بلند ایسے نہ رتبے کسی نبیؑ کے ہوئے
زہے نصیب ! کہ ہم امتی اُسی کے ہوئے

اُنہوں نے حضور اکرم ﷺ کے دوسرے معجزات مثلاً یہ کہ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کا سایہ نہیں تھا، آپ ﷺ کی انگلیوں سے جاری ہونے والے پانی نے صحرا میں اسلامی لشکر کو سیراب کر دیا، کنکروں نے کلمۂ شہادت پڑھ کر آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دی۔

آنکھ والوں کو نظر آئی نہ پرچھائیں تری
میں تو دیوارِ ابد تک ترا سایہ دیکھوں

اُن کے قدموں نے دکھائے راستے افلاک کے
ہو گیا اللہ اُس کا ، جو بشر اُن کا ہوا
وہ صحراؤں میں بھی پانی پلا دیتے ہیں پیاسوں کو
کہ اُن کی انگلیوں میں بھی سمندر رقص کرتا ہے

مظفر وارثی کا کہنا ہے کہ میرے پیارے نبیؐ، قران کے لفظ لفظ کی عملی دلیل ہیں ۔قران کے لفظ لفظ سے جو روشنی پھوٹتی ہے اُس میں میرے مصطفےٰؐ کے رنگ ہیں۔ چوں کہ قران اللہ کریم کا کلام ہے تو حضورﷺ خدائے واحد و یکتا کے ہونے کا ثبوت ہیں۔ آپؐ کا اُسوہ وہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی ترقی یافتہ تہذیب ہو، آپ کی سنت اور حدیث سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ اُن کی نظر میں قران پڑھنے کا مطلب حضورﷺ کی ہستی سے ملاقات ہے کیوں کہ آپ کے خد و خال سے لے کر اوصاف تک سب کچھ قرانِ حکیم کی تحریر میں ملتا ہے۔

ایک اور نعتیہ شعر میں یہی بات بہت عمدہ اور مختلف انداز میں کہی ہے کہ قران پڑھا کرو کیوں کہ اُس کے حروف کا مفہوم ہو یا رسول اللہ کی افعال و اعمال دونوں میں کوئی فرق اور بُعد نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے حضور پاکؐ کے اخلاق سے متعلق سوال پوچھا تو ام المومنینؓ نے جواب دیا تم نے قران نہیں پڑھا؟ گویا آپؐ کی حیات قرانِ حکیم کی عملی تفسیر ہے۔

ایک اور مقام پر ہمارے ممدوح نعت نگار نے کیا ہی نقطہ آفرینی کی ہے کہ آپؐ غارِ حرا میں اعتکاف کرتے، اُس کیفیت میں غور وفکر کرتے، وحی بھی نازل ہوتی۔ آپ کو ربِ دو جہان کی طرف سے جو پیغام پہنچایا جاتا، آپؐ صفا کے مقام پر اُس کا انکشاف فرماتے۔ اُس کی وضاحت اور تفسیر بیان کرتے۔ یوں آپؐ کی احادیث حقیقت میں اللہ ہی کے فرمان کے تابع ہیں۔ مظفر وارثی کہتے ہیں کہ آپؐ نے اپنے کردار سے تہذیبِ زندگی اِس طرح سے کی کہ جو بات ظلم سے نہ ہو سکی آپؐ نے پیار و محبت سے کی۔ یہ ایسے ہے کہ جیسے مہر و ماہ بھی روشنی نہ دے پائے مگر آپ کے کردار نے اجالے پھیلا دیئے اور کائنات کی تزئین کی۔ مظفر وارثی کہتے ہیں کہ میں جب بھی

آپ کے کردار سے متعلق سوچتا ہوں۔ میری آنکھوں میں ہوا روشنیوں کا سرمہ سا لگاتی ہے۔ اُن کے کلام میں کمال پروازِ فکر ہے۔ بنیادی مضامین تو وہی ہیں جن کو دیگر نعت نگاروں نے بھی بیان کیا ہے مگر مظفر کی افکار میں ندرت ہے۔

جب بھی ترے کردار پہ دوڑاتا ہوں نظر میں
سرمہ سا لگاتی ہے ہوا روشنیوں کا
قرآں کے لفظ لفظ سے پھوٹے جو روشنی
اُس میں تمام رنگ مرے مصطفیٰؐ کے ہیں

محبانِ رسول اللہ ﷺ نے آپ کی حیاتِ طیبہ کا کوئی لمحہ بھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ آپؐ کی احادیث اور سنن سے استفادے کے لیے اک ایک بات اور اک ایک عمل کو محفوظ کر لیا اور اُسے تاریخ بنا دیا۔ آپؐ کے سوا کوئی ہستی کائنات میں آئی کہ جس کی پاکیزہ زندگی کو اِس مبسوط اور مربوط انداز میں محفوظ کر دیا گیا ہو کہ جس سے آنے والی صدیاں استفادہ کرتی رہیں۔

اسی لیے مظفر وارثی کہتے ہیں کہ آنے والے ہر دور کو خیر البشر کے در کی روشنی بانٹ دو تا کہ تاریک ذہن اُس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ علم و ہنر کی روشنی آپؐ کی عطا کی ہوئی خیرات ہے۔ آپؐ کی ہر بات کم علم ذہنوں سے غفلت کے پردے ہٹا دیتی تھی۔ آپ کو فرماتے تھے، وہ اصحابِ رسول پر علم و حکمت کے نئے در وا کر دیتا تھا۔ آپؐ کی ہر سانس اسرارِ حقیقت کا مخزن اور ہر لمحۂ حیات تاج میں ٹانکے ہوئے ہیرے کی طرح تھا۔ آپؐ معلمِ کتاب و حکمت تھے۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے آپ کو رحمت العالمین پکارا:

ایک ایک لمحہ جس کا زمانے کو حفظ ہے
تاریخِ زندگی کا وہ کردار آپؐ ہیں
زندگی کے راستوں میں یوں گزر اُن کا ہوا
جان کا دشمن بھی اُن کو دیکھ کر اُن کا ہوا

پڑھو تو محمدؐ بھی قران ہیں
کہ مفہوم ِحرف و ادا ایک ہے
جو بات ظلم سے نہ ہوئی پیار سے ہوئی
تہذیبِ زندگی ترے کردار سے ہوئی
جو مہر و ماہ بھی نہ زمانے کو دے سکے
وہ روشنی ترے کردار سے ہوئی
تخلیقِ کائنات بھی صدقہ حضورؐ کا
تزئینِ کائنات بھی سرکار سے ہوئی
کہا وہی ہے معلم کتاب و حکمت کا
لقب اُسی کو دیا کبریا نے رحمت کا

حضور عالی مرتبت کو کبھی شفیع المذنبین اور کبھی شافع محشر اور شافع روزِ جزا کہا جاتا ہے۔ کچھ شعرا نے تو شیخ جی کو مخاطب کر کے کہا کہ مجھے میرے اعمال اور روزِ قیامت سے مت ڈرا کہ خواجۂ کونین شافعِ محشر ہیں۔ میرے لاکھ گناہ سہی، ہزار لغزشیں سہی مگر شفیع المذنبین کا التفات میرے لیے کافی ہے۔ جزا و سزا کے دن ہم گناہ گاروں کو نبیؐ حق و صداقت کا آسرا ہے۔ لیکن کچھ نعت نگار روزِ محشر اور پیارے نبیﷺ کی شفاعت کو اِس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ جیسے وہ واقعات پیش آ چکے ہیں اور اُن کی شفاعت ہو چکی ہے۔ یہ باتیں خلافِ واقعہ ہیں اور اُن سے اجتناب لازم ہے۔ جیسے سعادت حسین وارثی شیدا کا ایک شعر دیکھیے:

کرم اتنا ہوا مجھ پر شفیع روزِ محشر کا
کہ نکلا ہر ورق سادہ مرے عصیاں کے دفتر کا

مظفر وارثی کے ہاں بھی شفاعت کا مضمون موجود ہے۔ کہتے ہیں مجھے فنا کے بعد آپ ہی کا آسرا ہے کہ آپؐ شافعِ روزِ جزا ہیں۔ مزید کہتے ہیں کہ میں اپنے اچھے اعمال کی بے وزنی کا

کیا ڈر ہو کہ محمد ﷺ کا امتی ہوں۔لیکن دو مصارع کھٹکتے ہیں کہ جن پر دینی علما بہتر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں:

رحمتوں کی سفارش پہ تقدیر نے ، میرا ہر اک جرم اپنے سر لے لیا
اب نہ روکے گا رضوانِ جنت ہمیں، اُن سے پروانۂ رہ گزر لے لیا

چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپؐ ہی کا آسرا بعدِ فنا
شافعِ روزِ قیامت آپؐ ہیں
کیا ڈروں بے وزنیٔ اعمال سے
یا محمدؐ جب سلامت آپؐ ہیں
سلطنت سے بھی اعلیٰ گدائی ملی،
اُن کا قیدی ہوا تو رہائی ملی
رحمتوں کی سفارش پہ تقدیر نے،
میرا ہر اک جرم اپنے سر لے لیا
کچھ نہ کچھ ہم ہیں اُن کی دانست میں،
نام اپنا بھی ہے اُن کی فہرست میں
اب نہ روکے گا رضوانِ جنت ہمیں،
اُن سے پروانۂ رہ گزر لے لیا

نعت نگاری کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا نعت نگار ہو جس نے ظہورِ قدسی اور اُس کے نتیجے میں عالمِ انسانیت پر مرتب ہونے والے اثرات کا ذکر نہ کیا ہو۔اِس موضوع پر ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی انفرادی حالت، اُس معاشرے کی اجتماعی کیفیت اور پھر حضور پُر نورؐ کی آمد اور اُن کے برپا کیے ہوئے انقلاب کے بعد کے سماج اور معاشرے کا ذکر سب کچھ شامل ہے۔

مظفر وارثی مرحوم کے ہاں بھی یہ مضمون پوری فکر انگیزی کے ساتھ موجود ہے۔ آپ ؐ کی ولادت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ آج اُس نبی ؐ کی آمد کا بابرکت دن ہے جسے سارے انبیاؑ کی امامت کے درجے پر فائز کیا گیا۔ آمد کی وہ گھڑی ایسی تھی کہ ہر دوسری گھڑی اُس پر فخر کرتی ہے کہ وہاں سے ہی انسانیت کے عروج کا سفر شروع ہوا۔ جب جھوٹی لکڑی پتھر کے اصنام منہ کے بل زمین پر آ گرے اور آدمیت کی عظمت آثار پیشانی معبودِ حقیقی کے آگے جھک گئی۔

آج ہے اُس نبی ؐ کی ولادت کا دن
سارے نبیوںؑ کی جس کو امامت ملی
جھوٹی معبودیت منہ کے بل گر پڑی
صحنِ کعبہ کو سچی عبادت ملی

اہلِ علم کہتے ہیں کہ جب اجرامِ فلکی کو نور نہیں ملا تھا، جب مہ و نجوم کو روشنی نہیں عطا ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اجرامِ فلکی کا وجود ہی نہیں تھا۔ اُس وقت بھی آپ ؐ کا نور جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ آپ ؐ کا نور نورِ خدا سے جدا نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ خلاقِ جہاں نے آپ ؐ کو اپنی تجلیات کا مظہر بنا دیا۔ آپ کا نورِ نبوت جہاں جہاں پہنچا، وہ جگہ جلوہ گاہِ طور ہو گئی۔ مظفر وارثی نے لکھا ہے کہ کوئی اُن کے حسن و جمال کا کیا اندازہ کر سکتا ہے کہ جن کی کملی کا کنارہ بھی سحر کی روشنی ہے۔ میں جب آپ کو اپنی آنکھوں میں بسا کر ساری دنیا کو دیکھتا ہوں تو ہر سحر میں مجھے آپ ؐ کی جبینِ اطہر کا نور دکھائی دیتا ہے۔ غارِ حرا نے چوں کہ آپ کے کفِ پا کو بوسہ دیا تھا اِس لیے ہی آج تک دنیا میں حرا روشنی کا استعارہ بن چکی ہے۔

کون اندازہ کرے اُن کے جمال و حسن کا
جن کی کملی کا کنارہ ہے سحر کی روشنی
تجھ کو آنکھوں میں لیے جب میں یہ دنیا دیکھوں
ہر سحر میں ترے ماتھے کا اجالا دیکھوں

پوری تاریخِ جہاں کی روشنی اتنی نہیں
لمحے لمحے میں اجالا جس قدر اُن کا ہوا
رحمت ا للعالمین ﷺ کے اُس نے چومے تھے قدم
آج تک غارِ حرا سر چشمۂ انوار ہے

اُن پر خدانے کھولا درِ چرخِ چنبری
دیکھی مہ ونجوم نے عظمت رسول ﷺ کی
(اکرم کُنجاہی)

شیریں لہجے کا نعت نگار (ماہرالقادری)

اُن کا اصل نام منظور حسین تھا۔ ضلع بلند شہر کے قصبے کسیر کلاں میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک علی گڑھ سے کیا۔ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر اپنے ذاتی مطالعے سے بڑے معرکے سر کیے۔ اُن کے والد بھی شاعر تھے اور صرف تقدیسی ادب میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ماہر نے کسی سے اصلاح نہیں لی البتہ سینکڑوں لوگوں نے اُن سے استفادہ کیا۔ زندگی کے ۱۰ برس حیدر آباد دکن میں گزارے وہاں زیادہ تر وقت فانی بدایونی اور مولانا عبدلقدیر بدایونی کے ساتھ گزرا۔

۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے آئے۔ کچھ عرصہ ملتان میں بیتا پھر مستقل کراچی تشریف لے آئے۔ ایک مجلّے ''فاران'' کا اجرا کیا جو ۳۰ سال تک مستقل اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ اُن کی مذہبی نظموں میں ظہورِ قدسی اور قران کی فریاد معرکہ آرا ہیں۔ دیگر مشہور نظموں میں گنگا کا کنارا، جمنا کا کنارا، مامتا کی لاش اور نوجوان بیوہ بے حد پسند کی گئیں۔ مجموعہ ہائے کلام محسوساتِ ماہر، نغماتِ ماہر، جذباتِ ماہر کے نام سے شائع ہوئے۔ ذکرِ جمیل اور فردوس کے نام سے نعتیہ مجموعے بھی

اشاعت پذیر ہوئے۔

مولانا ماہر القادری کی عمر کا بیشتر حصہ سفر میں گزرا۔۱۹۴۲ء میں ایک بار مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے۔ وہاں فلمی دنیا کے بھی کچھ دوست موجود تھے۔ اُنہوں نے ماہر القادری کو گیت لکھنے کی پیش کش کی۔ اِن کا قیام بمبئی میں طویل ہو گیا۔ وہاں چند مہینے بسر کیے اور کچھ فلموں کے نغمات تحریر کیے جو مقبول ہوئے مگر یہ محسوس کرتے تھے کہ اُس نگری کا رنگین ماحول اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اِن کے دینی افکار بھی اُس ماحول کو اجنبی قرار دیتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جہاں ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق متحرک تھے۔ وہیں مولانا مودودی کی قیادت میں اسلامی ادب کی تحریک کا بھی آغاز ہوا۔ ماہر القادری اِس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

نوشاد، کاردار پروڈکشن کے لیے کام کرتے تھے۔ ایک ملاقات میں اُن کی خواہش پر ماہر القادری نے سب سے پہلے فلم جیون کا ایک گیت لکھا۔ بعدازاں تقدیر اور زینت کے گیت بھی لکھے جو شمشاد بیگم، محمد رفیع اور موتی لال نے گائے مگر جیسا کہ ذکر آ چکا ہے اُن کے مذہبی میلانات اِس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ بمبئی چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ ساری عمر اس تاسف میں گزری کہ فلموں کے لیے گیت کیوں لکھے۔ ایک مشاعرے کے لیے جدہ تشریف لے گئے۔ جہاں مشاعرے کے دوران دل کا دورہ پڑنے سے ۱۹۷۸ء میں انتقال کر گئے۔

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

ہم نے بچپن میں دیکھا کہ جب مساجد یا دینی محافل میں یہ سلام پڑھا جاتا تھا تو ایک عجیب لذت اور سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم دربار رسالت ﷺ میں باادب کھڑے ہیں اور حضور ﷺ کی خدمت میں اپنا یہ نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ اُس وقت ہمیں یہ خبر بھی نہیں تھی کہ یہ عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا کلام جسے نعت نگار نے سچے جذبے اور اخلاص کے ساتھ، دل کی گہرائیوں کے ساتھ لکھا ہے۔ اِس لاجواب سلام کے خالق

مولانا ماہر القادری ہیں۔اُنہوں نے اور بھی درود وسلام لکھے تھے مگر مذکورہ بالا سلام اپنی سادگی اور شیرینی کی وجہ سے دل میں اُتر جاتا ہے۔اُن کے ایک اور درود وسلام کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

درود اُس پر جسے شمع شبستانِ ازل کہیے
درود اُس پر ابد کی بزم کا جس کو کنول کہیے
درود اُس پر بہارِ گلشنِ عالم جسے کہیے
درود اُس ذات پر فخرِ بنی آدم جسے کہیے

افراط وتفریط (خودکو بچایا) رشید وارثی کی کتاب میں ''اُردو نعت اور شاعرانہ تعلی'' کے عنوان سے ایک بھر پور مضمون موجود ہے۔رشید وارثی نے تخلص حذف کر کے ایک شعر نقل کیا ہے ''خود بینی وخود ستائشی انسان کو کس قدر خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے، اس کا اندازہ تعلّیٰ پر مبنی اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے: (تخلص)

شرف ملا ہے یہ نعتِ رسولﷺ سے
جس جا ہے ان کا نام ، وہیں تیرا نام ہے

اسی طرح ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

کوئی حسانؓ ہے، کوئی اعجازؔ ہے
کیسے کیسے ہیں مدحت سرا آپ ﷺ کے

اِس طرح کے اشعار ممتاز شاعر صہبا اختر کے نعتیہ مجموعے میں بھی مل جاتے ہیں۔یہ انتہا درجے کی بے ادبی ہے کہ کوئی شاعر کہے کہ جہاں آپ کا نام ہے وہیں میرا نام ہے یا شاعر خود کو صحابی اور شاعرِ رسولﷺ، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے برابر ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔نعت نگاری خود ستائی کی بجائے عجز وانکساری اور کم مائیگی کے اظہار سے فروغ پاتی ہے۔

اب ماہر القادری کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے اور اُن کے متوازن فکر اور احتیاط پسندی کی داد دیجیے:

نعت گوئی میرا منصب ہے، نہ میں حسانؓ ہوں
میرے آنسو شعر بن جائیں، تو میں کیا کروں (ماہر)

ماہر القادری کی نعت نگاری کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ اکثر اُنہوں نے ایک ہی مضمون یا فضا میں مکمل نعتیں کہی ہیں، چاہے وہ غزلیہ ہئیت ہی میں کیوں نہ ہوں۔ اُنہوں نے کئی ایک نعوت میں، ظہورِ قدسی سے پہلے کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ ماہر نے مہارت سے اپنی ایک نعت میں اُس دور کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ جہانِ آب وگل مدت سے تاریکی میں تھا۔ ہر طرف ظلم و جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ سارے عالم کی عجیب کیفیت تھی۔ انسانی زندگی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ راستے کی خبر تھی نہ منزل کا پتا۔ اہلِ دانش بھی اس قدر جہل کے فریب میں تھے کہ خود تراشیدہ اصنام کو معبود بنائے ہوئے تھے۔ آدمی اپنے حقیقی معبود سے نا آشنا تھا۔ اچھائی اور برائی کا فرق مٹ چکا تھا۔ لوگوں کی نظر ذاتی مفادات پر تھی، خیر شر سے اُنہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ کوئی تہذیب یافتہ دستورِ حیات نہ ہونے کی وجہ سے انسان حیوان بنا ہوا تھا۔

ہمارے ممدوح نعت نگار نے مذکورہ نعت میں آپ کو ابراہیمؑ کا نورِ نظر لکھا ہے، اسمعیلؑ کا لختِ جگر پکارا ہے۔ ختم الانبیاؑ اور خیر البشر کے نام سے یاد کیا ہے۔ کہا ہے کہ آپؐ وہ ہیں کہ نغمۂ داؤد میں جن کا ترانہ ہے، گریۂ یعقوب میں جن کا افسانہ ہے۔ آپ کے تشریف لانے کو گلستاں کی سحر لکھا ہے۔ مثنوی کی ہئیت میں نظمیہ نعت کے چند اشعار قارئین کی نذر:

وہ آئے جن کے آنے کی زمانے کو ضرورت تھی
وہ آئے جن کے آنے کے لیے بے چین فطرت تھی
وہ آئے جن کے ہر نقشِ قدم کر رہنما کہیے
وہ آئے جن کے فرمانے کو فرمانِ خدا کہیے
تاروں سے کہہ دو کوچ کریں خورشید منور آتے ہیں
قوموں کے پیمبر آتو چکے، اب سب کے پیمبر آتے ہیں

خود تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکتے تھے سر
آدمی دنیا میں رہ کر ، اپنے رب سے بے خبر

معراج کا معجزہ تاریخِ انسانی کا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس پر عقل انگشت بہ دنداں ہے۔ حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے جہاں قدسیوں کے قدم بھی نہ پہنچے جہاں انبیاؑ بھی نہ جا سکے۔ آپؐ کی وہ رفعت و سربلندی خیال اور سوچ سے ماورا ہے۔ جہاں تک ہمارے لاشعور کی انتہا بھی نہیں، اُس عرش کی بزم میں خلق کا سردار ضیا بار ہوا۔ وہ ایسا عظیم سفر تھا کہ حضورؐ کے قدموں میں چاند تارے بچھ گئے۔ کائنات کی ساری کی ساری رفعتیں آپؐ کے قدموں کے نیچے آ گئیں۔ بشر اُس عظمت و رفعت سے نوازا گیا کہ نوعِ انساں فخر کرنے لگی۔ شبِ معراج بشر کے لیے راتوں میں سرتاج قرار پائی۔ حفیظ تائب کہتے ہیں:

انوارِ لامکاں تھے پیمبر ﷺ کے منتظر
بابِ مشاہدات کھلا آپ کے لیے

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں سے آگے طائرِ سدرہ کے پر جلنے لگے۔ پھر اُس کے بعد تو ایک عبد تھا اور معبودِ حقیقی کی ذات تھی جس نے سارے اسرار سے حجابات اٹھانے تھے۔ جس طرح ظہور قدسی کے موضوع پر ماہر کے نعتیہ اشعار ایک ہی فضا یا موضوع پر ملتے ہیں۔ اِسی طرح معراج بھی اُن کا خاص موضوع ہے، کہتے ہیں عرش پر آج خاص جلوے ہیں کہ حبیبِ خدا عرش پر بلائے گئے ہیں۔

لوح وقلم، عرش و کرسی کے سب پردے اٹھا دیئے گئے۔ اُنھوں نے سفرِ معراج میں آپؐ جہاں جہاں تشریف لے گئے شاعر نے اُن مقامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت جبریلِ امینؑ اور آپؐ کی سواری براق کے ذکر سے اشعار کے حسن و خوبی میں اضافہ کیا ہے۔ آپ کی شوکت و اجلال اور رفعتوں کو دیکھ کے حضرت جبریلؑ بھی حیران و ششدر تھے۔ عرشِ بریں آپؐ کی دید کا مشتاق تھا۔ آپؐ مسجدِ اقصیٰ بھی تشریف لے گئے جہاں آپؐ نے سارے نبیوں کی امامت

کی۔ براق نور کی گرد اڑاتا جا رہا تھا اور ستارے آپ کی گزرگاہ بنتے جا رہے تھے۔ آپؐ کے استقبال میں افلاک کو خوب سجایا گیا۔ عبد پر معبود نے کائنات کے سارے اسرار منکشف کر دیئے۔ لیکن میں ایک بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اُنہوں نے یہ کیوں لکھا:

''ایک ہی سطح پہ ہے مرتبۂ غیب و شہود''

معراج میں یہ شوکت و اجلال ِ مصطفےٰﷺ
جبریلؑ بھی ہیں دیدۂ حیراں لیے ہوئے
جس کا مشتاق ہے خود عرشِ بریں آج کی رات
حرمِ کعبہ کے اندر ہے مکیں آج کی رات
سارے نبیوں کی ہیں جھرمٹ میں نبی آخرﷺ
قابلِ دید ہے اقصیٰ کی زمیں آج کی رات
نور کی گرد اڑاتا ہوا پہنچا جو براق
رہ گزر بن گئی تاروں کی جبیں آج کی رات
قاب قوسین تو ہے قرب کی پہلی منزل
بندہ اللہ سے اتنا ہے قریں آج کی رات
ایک ہی سطح پہ ہے مرتبۂ غیب و شہود
اٹھ گئے سارے حجاباتِ حسیں آج کی رات
ہے معراج، ارض و سما آج ماہر
سجائے گئے جگمگائے گئے ہیں
معراج کی شب ایسے انوار نظر آئے
بے پردہ خدائی کے اسرار نظر آئے

نعت نگاری کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ شاعر آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو اللہ کریم کے نزدیک ایک ایسا حکم ہے جس کا حکم، اللہ نے فرشتوں اور انسانوں کو بھی قرانِ پاک میں دیا ہے۔ ماہر القادری نے اپنی ایک نعت میں پہلے آقائے نام دار کو عقیدت سے درود و سلام کا تحفہ پیش کیا ہے اور پھر حضور کے کچھ دیگر معجزات کا ذکر کیا ہے۔ تاریخِ اسلام بتاتی ہے کہ آپؐ کی مٹھی میں بند کنکروں نے کلمہ پڑھ کر آپ کی رسالت کی گواہی دی تھی۔ آپؐ کی انگشتِ شہادت کے اشارے سے چاند دو لخت ہو گیا تھا۔ آپ کا اشارہ پا کر ڈوبتا ہوا سورج واپس پلٹ آیا تھا۔ سبحان اللہ۔ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

سلام اُس پر کہ جس کی چاند تاروں نے گواہی دی
سلام اُس پر کہ جس کی سنگ پاروں نے گواہی دی
سلام اُس پر کہ جس نے چاند کو دو ٹکڑے فرمایا
سلام اُس پر کہ جس کے حکم سے سورج پلٹ آیا

میں ایک روز ممتاز نعت گو اقبال عظیم کا یہ شعر پڑھ رہا تھا:

اقبال ہم کو فکر نہیں روزِ حشر کی
مانوس ہیں مزاجِ شفیع الامؐ سے ہم

کیا اعمال نامے دائیں اور بائیں ہاتھ میں دینے والی ساری کہانیاں ہیں؟ نعت کا مضمون کمزور ہے۔ شفاعت کے لیے دلیل بہت کمزور ہے۔ کیا شفیع المذنبین کے مزاج سے مانوس ہونا ہی کافی ہے؟

شفاعت کے مضمون کو تمام ہی نعت گوؤں نے اپنے نعتیہ کلام میں باندھا ہے۔ ماہر القادری بھی کہتے ہیں کہ یہ دنیا ہو یا قبر کی تاریکی، عالمِ برزخ ہو یا روزِ محشر، مجھے تو صرف آپ ہی سے مطلب ہے۔ کسی اور سے غرض نہیں، اِس لیے کہ آپؐ دونوں جہاں میں رحمت، حق شعاری اور سچائی کا معیار ہیں۔ ماہر القادری کے مندرجہ ذیل نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ پہلے شعر پر غور کیا جائے

تو یہ تصوراتی اور خیالی ہے اور ایک ایسے واقعہ سے متعلق ہے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا مگر ہمارے شعرا نعتیہ ادب میں کچھ ایسے انداز سے بھی اظہار کرتے ہیں کہ جیسے یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ نعت ، ہئیت نہیں فکر کا معاملہ ہے، لہذا اِس صنفِ ادب کے تقدس کو ذہن میں رکھتے ہوئے فکری اعتبار سے احتیاط لازم ہے۔

سرِ محشر خدا کی مغفرت نے کی پذیرائی
شفیع المذنبیں آئے ، گنہ گاروں کی بن آئی

دونوں جہاں کے واسطے رحمت، مرے حضورﷺ
معیارِ حق، دلیلِ صداقت، مرے حضورﷺ

جہانِ آب و گل ہو، قبر ہو، برزخ ہو، محشر ہو
مجھے اوروں سے کیا مطلب تجھی سے کام ہے ساقی

آپ نے زندگی کے عظیم تر مقاصد اور اُن کے حصول کے لیے بزمِ حیات کی تنظیم کی جس سے اکتساب کر کے سوکھی ڈال جیسی زندگی کا پتا پتا شاداب ہوا۔ ذرّوں نے فیض پایا تو روکشِ آفتاب ہوئے۔ بے تاب روحوں کے اضطراب کو چین اور قرار آ گیا۔ ماہر القادری اپنے اشعار میں کیا خوب صورت فکر کے موتی لٹا رہے ہیں کہ آپؐ ہی کی تربیت کا نتیجہ عزمِ حسینؓ تھا اور آپ ہی کی تربیت کا نتیجہ فقرِ بوترابؓ تھا۔

آپ نے عقل و شعور کو بصیرت اور قلوب کو زندگی بخشی۔ ایسی مسیحائی محمد مصطفےﷺ کے سوا کون کر سکتا تھا۔ آپ نے اہلِ عالم کو جو دستورِ حیات دیا، اُس کے اک ایک نقطے کو دوام حاصل ہے۔ آپ نے حدیث مبارک کی شکل میں جو فرما دیا اُس کو ثبات حاصل ہے۔

مندرجہ ذیل پہلے شعر کے مصرع ثانی پر غور کیجیے۔ آپؐ نے رخِ حیات کو اس طرح تازگی بخشی کہ زندگی کے ہر ایک گوشے میں انسان کی رہنمائی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ آپ نے رہبانیت سے منع فرمایا۔ زندگی میں اعتدال اور توازن کا درس دیا۔ دین کے علاوہ دنیا کے

معاملات میں بھی رہنمائی فرمائی۔

آپ قران حکیم کے صورت میں انسانیت کے لیے ایک ایسا دستورِ زندگی اور ضابطۂ حیات لے کر آئے جو ہر حوالے سے مکمل اور قابلِ عمل ہے۔ چراغِ دانش وحکمت ہے جس سے رہنمائی لینے سے قلب و ذہن فہم وفراست کے روشنی سے بھر جاتے ہیں۔ آپؐ سے پہلے دنیا کے کتنے پیچیدہ مسائل تھے۔ ہر شریف نفس پریشان حال تھا مگر آپ نے نئے اور پرانے سب مسائل کو پیغمبرانہ حکمت سے سلجھادیا۔

اہلِ عالم حیرت میں مبتلا ہیں کہ غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہونے سے آپؐ کے دنیا سے پردہ فرمانے تک تقریباً ۲۳ برس کا عرصۂ حیات بنتا ہے جو قوموں کی زندگی میں نہایت قلیل عرصہ ہے۔ آپؐ نے اِس مختصر وقت میں دنیا کے گوشے گوشے میں ہمہ گیر انقلاب برپا کر دیا۔ آپ ایک ایسا دستور چھوڑ کر تشریف لے گئے اور اپنے اصحاب کی ایسی تربیت کر گئے کہ وہ تہذیب واخلاق میں عظمت کے مینار بنے۔

سبحان اللہ، آپؐ کا وہ جلال کہ سطوتِ روم اور شوکتِ سومنات بھی سرنگوں ہوگئی۔ آپؐ کا لایا ہوا ضابطہ کہ ہر امیر وغریب نے اُس سے استفادہ کر کے دین ودنیا میں کامیابی حاصل کی۔ ایسے مونس وہم درد پیمبر ﷺ سے ماہر القادری بھی امید لگائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ ماہر نامراد بھی منتظر ہے اس سوختہ بخت کی جانب گوشۂ چشمِ التفات فرمائیے تاکہ اِس کی امیدیں بھی بر آئیں۔

میرے سرکار ہیں دو جہاں کے واسطے رحمت
شریعت آپ کی ہے دین و دنیا کی یک جائی
یہ بزم وہ ہے کہ جس بزم کے چراغوں سے
یقیں کو روشنی ، ایماں کو نور ملتا ہے
صلِّ علیک، یا نبیؐ، روزِ ازل دیا گیا

تیرے اصول کو خلود، تیری حدیث کو ثبات
کتنے ژولیدہ مسائل تھے جدید اور قدیم
جن کو سلجھا نہ سکا کوئی مفکر نہ حکیم
اللہ اللہ ! نبی عربیؐ کی تعلیم
کھل گئے عقدۂ دشوار بہ فیضِ تفہیم
ہر ترقی میں جھلک اسلام کی ہے
آج دنیا کو ضرورت اسی پیغام کی ہے
امیروں کو رازِ اخوت بتایا
غریبوں کے حاجت روا بن کے آئے
تیرے جلال کے حضور، سطوتِ روم سجدہ ریز
تیرے قدم پہ جبہہ سا شان و شکوہِ سومنات
کب سے کرم کا منتظر، ماہر نامراد ہے
اُس کی طرف بھی یا نبیؐ ، گوشۂ چشمِ التفات

آپ ؐکا خلق قران ہے۔آپ ؐ کے کردار کو خود قران نے خلقِ عظیم کہا۔اسی لیے آپ ؐکی ہستی دنیا کے لیے نمونۂ عمل ہے۔ صوفی تبسم نے کیا خوب کہا تھا کہ آپ ؐکا حسنِ خلق ،آپ کا لطفِ نظر اور عفو و درگزر جیسے کوثر و تسنیم کی خراماں خراماں کیف پرور روانی۔ آپ ؐ نے تلوار سے نہیں کریمانہ اخلاق سے دنیا کو زیرِ نگیں کیا۔آپ ؐکی نرمی ایسے تھی کہ تیر کی طرح سنگ و خشت کے سینے میں اُتر جاتی تھی۔آپ ؐ کی سیرت سے دو عالم کی نجات وابستہ ہے کیوں کہ آپ ؐکا اُسوہ عالمِ انسانیت کے لیے ایک معیار ہے۔آپ کی سنت زندگی کا اثاثہ ہی نہیں ذریعۂ نجات بھی ہے۔آپ کی احادیث نہ صرف فرقانِ خیر و شر ہیں بلکہ زندگی ہر ہر مسئلے کا حل اور ہر ایک درد کا مداوا ہیں۔ماہر القادری کہتے ہیں کہ ہر اعلیٰ کردار، عفت و عصمت آپ ہی کے اخلاق کا صدقہ ہے۔آپ کے

نقوشِ پا ہدایت ہی ہدایت ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ کی سنت پر عمل پیرا ہونا سرا سرنجات کا راستہ ہے۔

ترے کردار کا پرتو ہے، عصمت ہو کہ تقوی
ترے اخلاق کا صدقہ ہے، نیکی ہو کہ سچائی
مرے سرکار کے نقشِ قدم شمع ہدایت ہیں
یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستہ کہیے
تری زندگی کا پرتو ہے کمالِ آدمیت
تری شخصیت سے قائم ہے وقارِ نوعِ انساں

آپ کا خلق اور آپ کی گفتار، بشر کی سر بلندی کا جوہر ہے۔ آپؐ کا ہر قول، فرمانِ خدا ہے اور آپؐ کا ہر عمل ایاتِ قرانی کی تشریح ہے۔ اسی لیے آپ کے ارشادات سے انسانیت کو توحید کا راستہ ملا۔ ہم اگر زندگی کرنے کا قرینہ چاہتے ہیں تو آپؐ کا اُسوۂ حسنہ بہت کافی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کی سیرت میں سارے ہی اوصاف یک جا کر دیئے۔ ماہر کہتے ہیں پیارے پیغمبرﷺ کی گفتگو اگر چہ نہایت سادہ تھی مگر وہ حقائق کو اشکار کر دیتی تھی۔

اللہ رے نطقِ احمدِ مرسلؐ کی سادگی
ہر لفظ ہے حقیقتِ عریاں لیے ہوئے
اللہ کو مرغوب ہیں کیا تیری ادائیں
''قل'' کہہ کے سنی بات بھی اپنی ترے لب سے

آپؐ کے احسانات اور فیضان کا کیا شمار کیا جائے۔ آپؐ نے سرزمینِ حجاز پر ایسی کرم گستری کی کہ روح کے صحرا میں گلستاں کھلا دیئے۔ عرب کے ریگستان کو خلد و جناں بنا دیا۔ زندگی جو سنگ و آہن جیسی تھی، اُسے خلوص و محبت کی لطافتوں سے آشنا کر دیا۔ تکلفات اٹھا دیئے اور سادہ زندگی کی برکتوں سے زندگی کو فیض یاب کر دیا۔ حیات جو انسان کی کج روی پر اشک فشاں تھی اُس

کے لبوں پر ہنسی کے پھول کھلا دیئے۔

آپ کی احادیث کا ہر ہر نقطہ شعورِ حیات کے لیے اکسیر ہے۔ آپؐ نے جس پر ایک بار نظرِ کرم کر دی پھر زمانے بھر کی گردشیں اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں۔ آپ کی نوازشات سے صاحبِ زر اور مفلس دونوں بہرہ مند ہوئے۔ انسانیت پر آپؐ کا یہ کرم بے حساب و بے مثال ہے کہ آپؐ نے کفر و شرک کے تمام توہمات کو مٹا ڈالا۔

عبد و معبود میں تعلق استوار کر دیا۔ اُس سے بڑھ کر محسنِ انسانیت کے احسانات کیا ہوں کہ انسان کے لیے دستورِ حیات ''الکتاب'' آپؐ ہی کی وساطت سے ہم تک پہنچا۔ اِس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جو آپؐ کی ہستی کا عرفان نہ کر پایا خدا تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یوں خاک طیبہ کا ذرّہ ذرّہ سرمے کی طرح آنکھوں کے لیے شفا ہی شفا ہے۔

انسانیت اور اُس کا شرف مجروح تھے۔ آپؐ کے مکتبِ عرفاں سے وہ سبق ملا اور بصیرت عطا ہوئی جس نے زندگی کی تہذیب و تطہیر کر دی۔ حضورؐ نے کہیں تو عفو و درگزر سے بیگانوں کو اپنے دامنِ رحمت میں سمیٹ لیا اور کہیں متکبروں کے خلاف علمی جہاد میں بھی حصہ لیا۔

وہ آئے اور آئے بھی قرآں لیے ہوئے
تنظیمِ کائنات کا ساماں لیے ہوئے
نکلا حرا کے غار سے وہ نازشِ مسیح
سارے جہاں کے درد کا درماں لیے ہوئے
محمد مصطفیؐ کے مکتبِ عرفاں سے ملتی ہے
خرد مندی، فراست، حکمت و تدبر و دانائی
نگاہوں کو بصیرت دی، دلوں کو زندگی بخشی
کسی کو کب میسر ہے یہ اندازِ مسیحائی
کہیں عفو و رحمت کے جلوے دکھائے

کہیں وہ نبر آزما بن کے آئے
زمانے کی سوکھی ہوئی کھیتیوں پر
گھٹا بن کے برسے ، ہوا بن کے آئے
غبارِ راہ طیبہ سر مۂ چشمِ بصیرت ہے
یہی وہ خاک ہے جس خاک کو خاکِ شفا کہیے
تجھے جس نے نہ پایا وہ خدا کو پا نہیں سکتا
کہ تیری معرفت اللہ کی پہچان ہے ساقی

ماہر کے ہاں سرورِ دنیا و دیں کی مقدس سرزمین ''مدینہ منورہ'' سے عقیدت کا اظہار بھی ملتا ہے، یہ بھی اللہ کے حبیب سے محبت کے اظہار کا ایک انداز ہے کہ اُس دھرتی کو فردوسِ نظر کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں مسافرانِ راہ طیبہ پاک دل، پاک نفس اور پاک نظر ہوتے ہیں۔ مکہ کے بعد مدینہ ہی ایسا مقام ہے کہ جس کا سفر بڑی سعادت ہے کہ وہاں کہ تو کانٹے بھی۔ خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ماہر تجھے مبارک ہو کہ دل میں مدینے کی حسرت اور شوق رکھتے ہو۔ یہ بات جنت کی سند ہے۔ اذنِ حضوری و حاضری کی تڑپ بھی محبت کا ایک پہلو ہے کہ ہر عاشق اپنے محبوب کا دیدار کرنا چاہتا۔ اِس مقصد کے لیے وہ محبوب کے دیار کی خاک چھانتا ہے۔

کلامِ ماہر میں حاضری کے لیے وارفتگی، درماندگی اور بے چارگی ہے۔ وہ اذنِ حضوری چاہتے ہیں۔ یہ حاضری ہر مسلمان کے لیے اتنی مقدس اور بابرکت ہے کہ ماہر وہاں کے نظاروں سے مستفید ہونے سے پہلے اشکوں سے وضو کر لینا چاہتے ہیں تاکہ مدت سے اُن کے سینے میں شوق کا جو انگارہ جل رہا ہے، اُس پر آقا کی رحمت کا کوئی قطرہ اُس وقت نہ پڑ جائے جب وہ بے وضو ہوں۔ نعت نگار ماہر القادری وہاں کے ستونوں کو انوار کے فوارے اور روضے کی جالیوں کو رحمت کے گہوارے کہتے ہیں اور جنت کی رعنائیوں کو بھی مدینے کی گلیوں پر نثار کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں کی زمین کا تو فرشتے بھی عقیدت سے بوسہ لیتے ہیں۔ وہ شامِ مدینہ کو سراپا حسن

اور صبح فردوسِ بریں لکھتے ہیں۔ وہ حضورﷺ سے عرض کرتے ہیں کہ مجھ غریب کی دولت اور جمع پونجی یہی اشکِ ندامت ہیں جو لے کر آپؐ کے دربار میں پیش ہوں۔ میرے دل کا یہی فدیہ اور آنکھوں کا یہی کفّارہ ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ یہ اُس شہنشاہوں کے شہنشاہ کی بزم ہے جہاں یقین کو تابانی اور ایمان کو نور میسر آتا ہے۔

انسان کو کائنات میں کسی جگہ ذہنی و قلبی سکون ملے نہ ملے لیکن اِس دیارِ مقدس میں ہر درد کی دوا ہے۔ قلب کی بے تابیوں کو یہیں آ کر سکون ملتا ہے۔ دو جہاں کے سرور کا مقام مقدس حرم ہے۔ اہلِ دل یہیں آ کر سر جھکاتے ہیں۔ زندگی اُن کی محبت کے بغیر کچھ نہیں اور محبت اُن کی اطاعت کے بغیر بے روح ہے۔ شاعر کی یہ بات اللہ کریم کے حکم کے عین مطابق ہے۔ غمِ عشق نبیﷺ کو جب تک رفیقِ زندگی نہ کر لیں، دین کی عبادات ہی میں لطف ہے نہ دنیا کے معاملات میں کیف و سرور۔

یوں سمجھ لیں کہ ساغرِ حیات محمدؐ کے عشق کی حلاوت کے بغیر ٹھکرا دینے کے لائق ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ الفتِ سردارِ دو عالم کے طفیل ہی ممکن ہوا کہ میں آج سرکارؐ کے دربار میں آ پہنچا ہوں۔ میں سوچتا تھا کہ مقصودِ زندگی کیا ہے؟ ایک غیب سے آواز آئی ''صرف عشقِ رسولﷺ''۔ اسی لیے میں محمدِ عربیﷺ سے لو لگائے ہوئے ہوں کہ یہ وہ چراغ ہے جو آندھیوں میں جلتا ہے۔ وہ کوئے نبیؐ میں حاضری کے بھی آداب بتاتے ہیں کہ وہاں اِس طرح جانا چاہیے کہ ہر ہر قدم پر سجدۂ شکرانہ ادا کیا جائے اور ایک پل بھی اُن کی یاد سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رکتے
مری آنکھوں کو ماہر چشمۂ آبِ بقا کہیے
اتنا ہے فزوں شوق و تمنّائے مدینہ
جس سمت نظر جائے، نظر آئے مدینہ
زاہد تجھے جنت کی تمنّا ہو مبارک

میرے لیے فردوس ہے صحرائے مدینہ

وارفتہ و بے چارہ، درماندہ و نا کارہ
دربار میں حاضر ہے اک شاعر آوارہ

جو اشکِ ندامت ہے نادار کی دولت
دل کا بھی یہی فدیہ ، آنکھوں کا بھی کفّارہ

بادشاہوں کو ملی شاہی، مجھے عشقِ نبیؐ
اپنا اپنا ظرف جس کو جو میسر آ گیا

ماہر القادری کے نعتیہ کلام کے مطالعے سے قاری ایک بات کا بہ خوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اُنھوں نے غزلیہ ہئیت میں بھی عام طور پر ایک نعت میں سارے اشعار ایک ہی موضوع پر یا ایک ہی فضا میں لکھے ہیں۔ یہ یقیناً اُن کے ذہن کے زرخیزی اور فکر رسا کا نتیجہ ہے۔

ہر مسلمان کی طرح اُن کا بھی عقیدہ ہے کہ خدائے ہست و بود کے بعد کائنات میں ہمارے آقاؐ سیّد الکونین عظیم ترین ہستی ہیں۔ حق شناس جانتے ہیں کہ اُنؐ کی نبوت کا عرصہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ یہ الگ بات کہ اُن کے نبوت اہلِ عالم پر اُس وقت ظاہر کی گئی جب آپؐ کی دنیا میں ظاہری عمر چالیس برس تھی۔

شریعت کہتی ہے کہ آپ ﷺ ختم الانبیاؐ ہیں۔ ماہر کا کہنا ہے کہ محبت کا تقاضا ہے کہ انہیں محبوبِ خدا لکھا جائے۔ ذاتِ نبی ﷺ پر کون و مکاں کا شرف ختم ہو جاتا ہے۔ آپؐ کائنات کے ہر جز اور کُل کے نبیؐ ہیں۔

کائنات میں خدائی خدا کی ہے اور نبوت محمد مصطفےٰؐ کی ہے۔ ماہر لکھتے ہیں کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ اُنہیں دونوں جہانوں کا مقصود کہا جائے۔ عقیدت اور احترام ایسا ہو کہ اُن کا نام آئے تو باادب ہو کر سماعت کیجیے اور مرحبا صلِّ علیٰ پڑھیے۔

رسولِ مجتبےٰؐ کہیے، محمد مصطفےٰؐ کہیے

خدا کے بعد بس وہ ہیں
پھر اُس کے بعد کیا کہیے
شریعت کا ہے یہ اصرار،ختم الانبیاؐ کہیے
محبت کا تقاضا ہے کہ محبوبِ خدا کہیے
جب اُنؐ کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے
جب اُنؐ کا نام آئے ،مرحبا صلِّ علیٰ کہیے
محمدﷺ کی نبوت دائرہ ہے نورِ وحدت کا
اسی کو ابتدا کہیے، اسی کو انتہا کہیے
ذاتِ نبیؐ پہ ختم ہے کون و مکاں کا ہر شرف
آپؐ رسولؐ جُز و کل، آپ امامِ اِنس و جاں
ترے دورِ رسالت کا تعین ہو نہیں سکتا
ازل آغاز ہے ساقی ، ابد انجام ہے ساقی
اُنہی کی محبت ہے ایمان ماہر
جو کونین کا مدعا بن کے آئے

چوموں گا میں بے ساختہ آئینے میں آنکھیں
سپنے میں کسی رات جو دیدارِ نبیؐ ہو
(اکرم کُنجاہی)

ناصر کاسگنجوی کا عشق ساگر

ناصر کاسگنجوی ۱۹۲۸ء میں ضلع ایٹہ (اتر پردیش) کے ایک قصبے کاسگنج میں پیدا ہوئے تھے۔اُن کے والداحمد خان کیفی وکیل تھے مگر شعر وشاعری سے بڑا شغف تھا۔یوں انہیں شاعری ورثے میں ملی۔علی گڑھ گئے مگر بہ وجوہ تعلیم مکمل نہ کر سکے۔گریجوایشن تقسیمِ ہند کے بعد کراچی آ کر مکمل کی۔آل انڈیا ریڈیو کے رسالے''آواز'' میں ملازمت کی۔تقسیم کے بعد اوریئنٹ ائیرویز (اب پی آئی اے) میں ملازمت اختیار کی مگر بعد میں وزارتِ صنعت سے منسلک ہوئے۔ریٹائر منٹ لے کر اپنی بہنوں کے قائم کردہ گلشن گرامر اسکول میں پرنسپل ہو گئے۔سکول جب بند ہوا تو ریٹائرڈ زندگی گزارنے لگے۔اُنہوں نے ابتدائی طور پر کراچی میں بننے والی جن فلموں مثلاً وفا کی ادااور چوٹ کے گیت لکھے وہ مکمل نہ ہوسکیں۔اِن کے کریڈٹ پر ایک فلم''جان پہچان''اہم ہے۔اِس فلم میں محمد علی کے مقابل ایک ایرانی اداکارہ شہ پارہ کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ایک فارسی نغمے کی ضرورت پڑی۔فلم ساز کا خیال تھا کہ فارسی شعرا کے دواوین سے استفادہ کر کے سچوایشن کے مطابق کوئی غزل منتخب کر لی جائے مگر گیت لکھنے کی ذمے داری ناصر کاسگنجوی نے قبول کی اور فارسی میں ایک گیت تحریر کیا۔کہا جاتا ہے کہ برصغیر کی کسی فلم میں یہ پہلا فارسی گیت تھا جو کسی مقامی شاعر نے تحریر کیا تھا۔یہ گیت پسند کیا گیا۔

جانِ ما جانِ ماجانِ صد آرامِ ما
اے ہمہ خوبی، ہمہ محبوبی، پردہ کشا و رخ بنما
جانِ ما جانِ ماجانِ صد آرامِ ما
بر سرِ مژگاں، لرزاں لرزاں،عشق الم چوں نجمِ سحر
رخصت رخصت، دل ہمہ گوید شامِ فراق آمد صنما
جانِ ما جانِ ماجانِ صد آرامِ ما

اس فلم کا ایک اور گیت بھی مقبول ہوا تھا۔ جب شاہ ایران پاکستان کے دورے پر آئے تو ناہید نیازی نے یہ گیت اُن کے سامنے پیش کیا تھا۔ ناصر کا دل جلد فلمی دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور وہ اِس شعبے سے دور ہوگئے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کا شمار اپنے عہد کے بہترین اور استاد شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کی تصانیف میں خمارِ دوش، سرورِ امروز (غزلیات)، جذب وجنوں (منظومات)، ریزہ ریزہ سنگ (قطعات و رباعیات)، اور دیارِ گل (نعتیں) شامل ہیں. ناصر کاسگنجوی کو 2001ء میں کینسر کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اس مرض کے سبب 22 جون 2002ء کو کراچی، پاکستان میں انتقال کر گئے۔ وہ ملک پلانٹ گلشن اقبال سے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہیں۔

حضورؐ کا جو مقام ہے حقیقت میں وہ ہمارے فہم وادراک کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ اُن کے مراتب سے صرف اللہ کرم کی ذات ہی واقف ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''۔ اپنے ایک شعر میں ناصر کاسگنجوی نے کیا خوب صورت مضمون باندھا ہے کہ دونوں جہانوں کا مالک ومختار قیامت صرف اِس وجہ سے قائم کرنا چاہتا ہے کہ تمام کائنات رسولِ آخرﷺ کا مقام ومرتبہ روزِ محشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ اُس دن ہر ذی روح کی امید کا مرکز و محور حاملِ قراں ہوں گے۔

آپ شفیعِ محشر کہلاتے ہیں کہ اُس دم آپؐ ہی انسانوں کی شفاعت کریں گے۔ صبحِ محشر وہ خورشیدِ جہاں تاب کچھ یوں چمکے گا کہ عاصیوں کی قسمت کا ستارہ جگمگا اٹھے گا۔ انہیں چھٹکارا نصیب ہوگا۔ جب ہر طرف قیامت میں سورج کی تمازت سوا نیزے پر ہوگی تو صرف آپؐ ہی کی شفاعت کا آسرا ہوگا کہ آپؐ اپنی رحمت کی گھٹاؤں کے ساتھ ہر طرف سایہ فگن ہوں گے۔ ناصر کو بھی یقینِ کامل ہے کہ اُس رحمتِ کل، مرجع خاصانِ دوعالم کی نگاہیں ہماری نگہبان ہوں گی اور وہ لب ہائے مبارک گنہگاروں کی شفاعت کی پیامی بنیں گے:

اللہ چاہتا ہے انہیں دیکھے کائنات
اتنی ہی بس قیامِ قیامت کی بات ہے

کوئی اُس گُلِ رسالت کی شگفتگی تو دیکھے
جو بنا دے تپتے صحرا کو مقام مہکا مہکا

آپ کئی اعتبار سے سراپا انوار ہیں۔انور مسعود اپنے کلام میں لکھتے ہیں کہ حضورﷺ کا وجودِ منیر، جبینِ وقت کا جھومر ہے۔ اِس لیے رخِ حیات آپ کے نور سے روشن و رخشاں ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ یہ سیلِ نور مصفا آپ کا صدقہ ہے کہ میری آنکھوں کا نور اور دل کا اجالا آپ ہی کا منت کش ہے۔

آپ مجسم نور، مکمل نور اور سراپا نور ہیں۔آپ انسانیت کی آسمان کے مہرِ درخشاں اور ماہِ منور ہیں۔دنیا کی ہر ہر محفل میں جو بھی روشنی اور نور ہے، بلاشک وہ آپ ہی کے حسن کا صدقہ ہے۔اسی وجہ سے ناصر کاسگنجوی کا کہنا ہے کہ میں نے جب جب نورِ رسالت کی بات کی میرا ہر نفس فروزاں ہو گیا۔اُن کا نام جب بھی میری فکر میں طلوع ہوتا ہے تو نفس نفس معطر اور نظر نظر اُجالے پھیل جاتے ہیں:

محسوس ہو رہا ہے فروزاں نفس نفس
لب پر اگرچہ نورِ رسالت کی بات ہے
ہے نفس نفس معطّر، ہیں نظر نظر اُجالے
کہ طلوع ہو رہا ہے کوئی نام مہکا مہکا

نعت گوئی کی فیوض و برکات کا ذکر ہر نعت گو نے کیا ہے۔ایک مومن مسلمان اگر شاعر ہے تو زندگی میں حضورؐ کی ہمہ گیر صفات کا منظوم اظہار ضرور کرتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ نعتیں فکر و نظر کی آبرو ہوتی ہیں۔نعت گو کا ایمان ہوتا ہے کہ نعت گوئی باعث سعادت اور توشۂ آخرت ہے۔ شاعر کو جب دل کی تپش کا وفور تڑپا کے رکھ دیتا ہے تو وہ نعت کہتا ہے۔جب وہ غمِ حیات کے بگولوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو حضور سے نظرِ کرم کی التجا کرتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ نعت کائنات کا وہ افضل ترین کام ہے جو اللہ کریم اور اُس کے فرشتے بھی درور و سلام کی صورت کرتے ہیں۔

بلا شبہ نعت گوئی آبِ حیات کا چشمہ ہے کیوں کہ نعت شہِ دوسراؐ عمر دوامی کا باعث ہے۔ حفیظ تائب، ریاض حسین چودھری اور جعفر بلوچ ہمارے ایسے نعت نگار ہیں جنھوں نے بیشتر نعتیہ اشعار میں اظہار خیال کیا ہے کہ نعت کیا ہے۔ دراصل یہ منظوم اظہار بھی تو نعت ہی ہے۔ ریاض حسین چودھری تو اپنے کلام میں یہاں تک کہتے ہیں کہ

شہرِ طیبہ کی گزر گاہوں میں جینا ، نعت ہے
جامِ حبِ سرورِ کونینﷺ پینا ، نعت ہے

اُن ہی کے اشعار اور دیکھ لیجیے:

نعت کیا ہے؟ عشق کے ساگر میں غرقابی کا نام
نعت کیا ہے؟ میرے ہر جذبے کی سیرابی کا نام
نعت کیا ہے؟ ہجر میں سانسوں کی بے تابی کا نام
نعت کیا ہے؟ گنبدِ خضریٰ کی شادابی کا نام

ویسے تو ناصر کاسگنجوی کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں مگر ایک خاص موضوع جس پر اُن کی نعوت میں کافی اشعار ملتے ہیں وہ از خود ''نعت'' ہے جسے وہ رسول اللہﷺ کی عنایت اور عطا سمجھتے ہیں۔ سانسوں میں موجِ نغمہ ونکہت خیال کرتے ہیں۔ طیبہ کے ذکر کو وادیٔ جنت کا ذکر قرار دیتے ہیں۔ وہ پیارے آقاؐ کے لیے بہت کچھ لکھنا چاہتے ہیں کہ سرکارؐ بے مثال بھی ہیں اور اُن کے اوصافِ حمیدہ کا شمار نہیں مگر کہتے ہیں شریعت کا پاس ہے کہ کہیں بات افراط کی شکل میں حدود سے تجاوز نہ کر جائے۔

مزید لکھتے ہیں کہ حسین وجمیل پیغمبر کے پیام کو عام کرنا ہی میرے فکر وفن کی جنت ہے۔ میری تو آرزو ہے کہ سرورِ عالمؐ کے آستاں پر جھوم جھوم کر درود وسلام پڑھوں اور ایسی بیخودی ہو کہ جسے ہمیشگی حاصل ہو جائے۔ دنیا جسے نعت کا نام دے کر مجھے سرافراز کر رہی ہے میرے لبوں پر وہی مہکا مہکا کلام رہتا ہے:

مرے فکر و فن کی جنت یہی کام مہکا مہکا
وہ حسیں حسیں پیمبر، وہ پیام مہکا مہکا
جسے نعت کہہ کے دنیا مجھے دے رہی ہے عزت
ہے مری زباں پہ ناصر وہ کلام مہکا مہکا

ناصر! نہیں کہ میری محبت کی بات ہے
یہ اُن کی نعت اُن کی عنایت کی بات ہے
ہے دل کی دھڑکنوں کی زباں پر اُنہیں کا ذکر
سانسوں میں موجِ نغمہ و نکہت کی بات ہے
کیا کچھ نہیں ہے دل میں پئے مدحتِ حضور ﷺ
دل کیا کرے مگر کہ شریعت کی بات ہے
سرکارؐ بے مثال ہیں، اوصاف بے شمار
وحدت میں گویا جلوہ کثرت کی بات ہے

سب رشک سے دیکھیں مہ و انجم اُسے شاہا
وہ ذرّہ کہ جو آپ کے قدموں میں رہا ہے
(اکرم کُنجاہی)

ولی صاحب

شمشاد بیگم کو ابھی فلمی گائیکی سے شہرت نہیں ملی تھی کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر اُن کی آواز میں ایک نعت ریکارڈ کی گئی:

پیغام صبا لائی ہے دربارِ نبی ﷺ سے
آیا ہے بلاوا مجھے سرکارِ نبی ﷺ سے

یہ نعت سننے ہر ہر سامع کو متاثر کر گئی۔ شمشاد بیگم کی شہرت آسمانی رفعتوں کو چھونے لگی۔ اِس مشہور نعت کے خالق ولی صاحب تھے۔ میٹرک کے بعد وہ میو ہسپتال میں ملازم ہو گئے، اسی دوران ۱۹۳۲ء میں اُن کا شوق انہیں ایک گراموفون کمپنی تک لے گیا جہاں مختصر عرصے میں اُنہوں نے لاتعداد نعتیں، غزلیں، گیت اور بھجن ریکارڈ کروائے۔ اُن کی ایک نعت بہت مقبول ہوئی جسے نامور موسیقار غلام حیدر کی بیوی امراؤ ضیا بیگم نے ترنم سے پڑھا تھا: ''میرا سلام لے جا''۔

ولی صاحب کو فلم نگری میں استاد کا درجہ حاصل تھا۔ اُس نگر کے کئی افراد اُن کے تلامذہ میں شامل تھے۔ ولی صاحب کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں پونا میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد عبدالکریم خان لودھی مدرس تھے۔ بعد ازاں وہ بہ سلسلۂ ملازمت لاہور منتقل ہوئے جہاں ولی صاحب کے بچپن اور جوانی کا زمانہ بیتا۔ نغمہ نگار ناظم پانی پتی اُن کے چھوٹے بھائی تھے جو اِن کی دیکھا دیکھی فلم نگری میں آئے۔ گراموفون کمپنی سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ فلم نگری کی طرف متوجہ ہوئے اور بمبئی اور لاہور میں ۵۰ کے قریب فلموں کے گیت یا مکالمے وغیرہ تحریر کیے مثلاً مجنوں، سورگ کی سیڑھی، جیون جیوتی، پردیسی ڈھولا، گل بکاؤلی، یملا جٹ، منگتی، سوہنی کمہارن، خزانچی، قسمت، گھر کی عزت، دوسری بیوی، چکوری، دکھ سکھ، شرون کمار، دیکھو جی، پتلی، ہیر رانجھا، پنا، پدمنی، بیوی، زمانے کی ہوا، گڈی گڈا وغیرہ۔ اُنہوں نے ایک درجن کے قریب ذاتی فلمیں

بھی بنائیں جن کے ہدایت کار وہ خود تھے۔اُنہوں نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھا۔ اُن کا کلام اُس دور کے ادبی پرچوں ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال، عالمگیر، ادبی دنیا وغیرہ میں با قاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔اُن کے حوالے سے ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ جب وہ اپنی فلم سوہنی کمہارن بنانے لگے تو گجرات سے ایک لڑکی ممتاز شانتی کے نام سے ہیروئن کے طور پر منتخب کی جو بعد میں برصغیر کی صف اول کی اداکارہ بنی۔ولی صاحب نے ۱۹۴۱ء میں اُس سے شادی کر لی۔ ۱۹۷۷ء میں ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد لاہور میں انتقال کر گئے۔

کردار کے گلاب کھلا کر چمن چمن
جیون کو آپؐ نے رخِ زیبا عطا کیا
(اکرم کُنجاہی)

نظرِ کرم کا متمنی شاعر صدیقی

کچھ عرصہ پہلے پبلیشر رنگِ ادب کراچی نے جب مجھے کہنہ مشق سخن ور شاعر صدیقی کی شعری کلیات کا مسودہ دیباچہ تحریر کرنے کے لیے دیا تو مجھ پر حیرتوں کے کئی در وا ہوئے۔بہت قلق ہوا کہ ایک ہمہ جہت تخلیق کار جو مشقِ سخن کی ابتدا ہی میں یہ شعر کہنے کی صلاحیت رکھتا تھا:

پاک بازانِ محبت نہیں دیکھے تم نے
تم سمجھتے ہو سبھی اہلِ ہوس ہوتے ہیں

ایسا زرخیز ذہن ہمارے درمیان رہتے ہوئے گوشہ نشین کیوں ہو گیا۔حمد، حمدیہ مناجات، حمدیہ فلمی قوالیاں (مناجات کے رنگ)،نعت، غزل، نثری اور آزاد نظم، رباعیات، قطعات، شخصی قطعات، دوہے، سانیٹ،فلم، ٹیلی وژن، ریڈیو اور کیسٹ کے لیے گیت، دوگانے، کورس۔اُس نے کیا کچھ نہیں لکھا مگر شاعرانہ تعلّی کہیں نہیں۔شاعر صدیقی بھی اُن شکستہ دل شعرا و

ادبا میں سے ہیں جنہیں دو بار ہجرت کا کرب سہنا پڑا، ایک بار تقسیمِ ہند کے بعد جب وہ بھارت سے مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں آباد ہوئے اور دوسری بار جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد انہیں بنگلا دیش سے بھارت اور نیپال کے راستے کراچی آکر مستقل ٹھکانہ کرنا پڑا۔ وہ اِس قدر دل شکستہ تھے کہ دوسری ہجرت نے اُن کے

تخلیقی سفر پر وقتی جمود سا طاری کر دیا اور ۱۹۷۰ء کے عشرے میں انہوں نے خود کو کافی عرصے تک محدود کر لیا۔ وہ ۱۹۳۳ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ کامل کلکتوی اور آصف بنارسی سے شاعری میں اصلاح لی۔

ہمارے ممدوح کی شاعری جس کی غزل ابتدا میں کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ تھی اور دوسری طرف وہ لیریکل شاعری کر رہے تھے۔ جس میں پُر جوش جذبات اور داخلی واردات کا اظہار تھا۔ ظاہر ہے یہ فلمی گیت نگاری کا تقاضا تھا۔ اُن کے لاتعداد گیت نور جہاں، مالا بیگم، شہناز

بیگم، فردوسی بیگم، ارونا لیلیٰ، طلعت محمود، سلیم رضا، احمد رشدی، بشیر احمد، روشن آرا، ایس بی جون، افراہیم، مجیب عالم، رجب علی، آئرن

پروین، ناہید نیازی، عالمگیر، نظیر بیگ (ندیم)، روبینہ بدر جیسے صفِ اول کے نام ور گلوکار خاص طور پر مشرقی پاکستان میں بننے والی فلموں کے لیے گا رہے تھے۔ اُن گیتوں کی موسیقی ایم اشرف، مصلح الدین، روبن گھوش، کریم شہاب الدین، اور ناشاد جیسے نابغہ روزگار فن کاروں نے دی اور یہ گیت مقبول ترین ادا کاراؤں پر فلمائے گئے۔ وہ بلا شبہ ایک منجھے ہوئے گیت نگار ہیں۔ انہوں نے گیت، دوگانے، کورس، کامیڈی دوگانے، فلمی قوالیاں اور نعتیں بھی لکھیں۔ فلموں کے علاوہ انہوں نے ڈھاکہ ٹیلی وژن، پاکستان ٹیلی وژن، ادبی جرائد اور کیسٹوں کے لیے بھی گیت نگاری کی۔ انہوں نے کراچی ہجرت کے بعد بھی گیت نگاری کی مگر اِس حوالے سے اُن کے عروج کا زمانہ یقیناً قیامِ ڈھاکہ ہی کا تھا کہ جب وجد آفریں گیتوں کی تخلیق میں اُن کا خونِ جگر بھی شامل ہوا۔ وہ مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت سے اُس وقت وابستہ ہوئے جب ڈھاکہ میں اُس

کی بنیاد ڈالی گئی کیوں کہ وہ ۱۹۵۰ء میں وہاں چلے آئے تھے۔اُن کی مشہور فلموں میں بھیا، سنگم، قلی، کارواں، پیسے، مینا، پھر ملیں گے ہم دونوں وغیرہ شامل ہیں۔سن رسیدہ ہیں اور اِن دنوں کراچی میں ادبی محافل سے دور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کلیاتِ شاعر صدیقی میں کئی پُر اثر نعتیں بھی شامل ہیں ۔ شاعر نے سلطانِ دو جہاں ﷺ کو چراغِ ضوفشاں قرار دیا ہے ۔اِس لیے کہ آپ ہی کی ذاتِ گرامی کی اعلیٰ صفات اور کردار کے جلوؤں نے جہانِ آب و گِل سے کہالت اور کفر کی تاریکیاں دور کی تھیں۔آج بھی ہم آپؐ کے کردار وافکار سے روشنی پاتے ہیں۔آپؐ کی ذات کا چرچا زمین ہی پر نہیں وافلاک پر بھی ہے ۔اللہ کریم اور اُس کے فرشتے بھی آپؐ پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔آپ رحمت للعالمین ہیں۔شاعر نے آپ کی رحمتوں کا ذکر کیا ہے کہ ہر دم آپ کا فیضِ عام جاری ہے۔آپ کا ہر قول قولِ خدا ہے۔آپ تلمیذ الرحمن اور امی ہیں آپ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتے بلکہ اللہ کے حکم سے فرماتے ہیں۔کلیاتِ شاعر صدیقی کی نعوت میں شاعر نے آپؐ کی ذاتِ گرامی کے معجزات کا ذکر بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ حضور ﷺ کا ادنیٰ سا کمال ہے کہ سنگ ریزے بھی کلام کرنے لگتے ہیں۔ کلامِ شاعر میں معراج شریف کا بھی ذکر ملتا ہے۔

آپ کا ادنیٰ سا یہ اعجاز ہے
بول اٹھے سنگ ریزے بے زباں
معجزہ معراج کی شب یہ ہوا
ہو گئے ساکت زمین و آسماں

انسان کی فطرت ہے کہ جس سے محبت کرتا ہے اُس سے منسوب اشیا اور مقامات سے بھی پیار کرتا ہے۔یہی وجہ ہے عشاق صادق اپنے نعتیہ کلام میں مدینہ شریف کی مقدس سرزمین سے اظہار عقیدت ومحبت کرنا کبھی بھی فراموش نہیں کرتے بل کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہماری نعتیہ شاعری کا اہم ترین اور بڑا موضوع ہے تو غلط نہ ہوگا۔

شاعر صدیقی نظر ہر وقت سوئے مدینہ رکھنے والوں میں سے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے تقدیسی کلام میں اِس بات پر طمانیت کا اظہار کیا ہے کہ مکہ اور مدینہ دونوں کی زیارت سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ انہیں مکے میں جلال اور مدینے میں ہر طرف جمال ہی جمال دکھائی دیا اِس لیے کہ مدینے میں روضۂ اقدس کا جمال اپنی تابانیاں دکھا رہا ہے۔ اُس سرزمین پر ہر وقت ہر طرف رحمتوں ہی کا نزول رہتا ہے۔ اِس لیے وہ اہلِ ایماں کو دعوت دیتے ہیں کہ چھوڑو یہ دنیا داری کہیں چلنا ہے تو مدینے چلیے، کہیں سے راہنمائی حاصل کرنی ہے تو حجازِ مقدس سے کیجیے، کسی زمین کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنانا ہے تو صرف خاک مدینہ ہی اِس لائق ہے۔ اِس لیے کہ اُس سرزمین کی زیارت کرنے اور وہاں کے اصول اپنانے سے قلوب و اذہان کو ایمان کی روشنی اور حرارت ملتی ہے۔

یوں لگتا ہے کہ جب آنکھوں کے سامنے روضے کی جالیاں ہوتی ہیں تو پلکوں پر ایک چراغاں کا سا سماں ہوتا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ مدینہ کا گلزار کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ وہ جنتِ ارضی ہے۔ اِس لیے کہ اُس کے سارے ہی نظارے خوش رنگ ہیں اور آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ اُن کی ایک دل کش نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نظر میں شہرِ مدینہ بسا کے لایا ہوں
میں آج نور کے سانچے میں ڈھل کے آیا ہوں
مرا نصیب کہ مکہ بھی اور مدینہ بھی
میں اپنی جاگتی آنکھوں نے دیکھ آیا ہوں
جلال کعبے میں دیکھا خدائے بر تر کا
جمال اُن کا مدینے میں دیکھ آیا ہوں
وہ سر زمیں کہ جہاں رحمتیں برستی ہیں
گلِ مُراد سے دامن کو بھر کے لایا ہوں

جمالِ روضۂ اقدس کی بات کیا کیجیے
سرور و کیف کی دنیا سمیٹ لایا ہوں
بتاؤں کیا تمھیں شاعر حضور ﷺ سے اپنے
جو بات دل میں تھی وہ بات کہہ کے آیا ہوں

اگرچہ اُن کے نعتیہ کلام کا غالب حصہ شہرِ نبی ﷺ سے عقیدے کی اظہار پر مشتمل ہے یا پھر اذنِ باریابی کے لیے تڑپ اور اضطرابی کے مضامین واضح ہیں مگر اہلِ ایمان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ حضور انور ﷺ کی عنایات اور مہربانیوں کا ذکر نہ کریں اور پھر آپ کے دربار میں دکھ، درد اور تکلیف میں آپ کی نظرِ کرم کے لیے التجا نہ کریں اس لیے کہ آپ کو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دراصل مدینہ منورہ میں حاضری کی خواہش کے پیچھے بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ آقا کے دربارِ اعلیٰ میں جا کر اپنی گزارشات پیش کریں اور اُن کے کرم کی بھیک مانگیں۔ شاعر صدیقی کی کلیات میں شامل نعوت میں کئی مقامات پر سیّدِ والا سے التجا ہے کہ آپ کا لطف و کرم ہو جائے تا کہ زندگی غمِ دنیا کے مقابل ڈٹ جائے۔ آپ کی دستگیری ہو جائے تا کہ بھنور میں پھنسی کشتی ساحل نصیب ہو جائے۔ میرا مقدر رشکِ مہ و انجم ہو جائے بلکہ کئی اشعار میں اُنہوں نے سردارِ انبیا ﷺ کے حضور امت کے اجتماعی دکھ درد بھی پیش کیے ہیں۔ امت کی حالت آپ کے گوش گزار کر کے درخواست کی ہے کہ آقا انسانیت پریشاں ہے، ابنِ آدم کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دیجیے۔ مزید براں شاعر نے اپنے قارئین کو بھی کہا ہے کہ آقا کا دامن تھام لیں تا کہ ہمارا فرد ابھی ہمارے ماضی کی طرح روشن و رخشاں ہو جائے۔ ایک عمدہ نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جس پہ لطف و کرم سیّدِ والا ہو جائے
زندگی اُس کی حریفِ غمِ دنیا ہو جائے
دستگیری جو کریں آپ ہماری آقا
بحرِ ظلمات کا منجدھار کنارا ہو جائے

آج کے دور کا انسان پریشاں ہے بہت
ابنِ آدم پہ کرم سیّدِ والا ہو جائے
تھام لیں اب بھی اگر آپ کا دامن ہم لوگ
اپنا ماضی جو کبھی تھا وہی فردا ہو جائے
میرے آقا ؐ کی اگر مجھ پہ نظر ہو شاعر
رشکِ خورشید مقدر کا ستارا ہو جائے

تازہ ہیں زخم سارے کہ ٹوٹا ہے پر ابھی
دیں گے سکت اڑان کی خیر البشر ابھی
(اکرم کُنجاہی)

جوش کا بے مثل اسلوبِ بیاں

جوش ملیح آبادی ہماری ادبی تاریخ کا ایک متنازعہ کردار رہے ہیں۔ اُن کی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی بارات'' اگرچہ ادبی اعتبار سے ایک بے مثال ادب پارہ اور تخلیق تھی مگر اُس کی اشاعت نے اُن کی شخصیت کو مزید متنازعہ بنا دیا۔ لیکن شاعر شباب و انقلاب کی زبان دانی، فکری وسعتیں اور شاعری سے متعلق دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ اُن کے شاعری میں لفظیات کی سحر آفرینی اور زورِ بیاں قاری کے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اُن کے آباواجداد کا پیشہ سپہ گری تھا مگر اُن کے پردادا فقیر محمد خان گویا کہنہ مشق شاعر اور داغ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ اُن کا دیوان بھی دستیاب ہے۔ جب کہ دادا نواب محمد احمد خان اور والد بشیر احمد خان بھی شاعر تھے۔ جوش کا قیام مختلف اوقات میں حیدر آباد دکن، لکھنو اور بمبئی میں رہا۔ سیماب صفت انسان

تھے۔ادبی رسائل ''کلیم''اور''آج کل'' کااجرا بھی کیا۔

انہیں بھارت کے سب سے بڑے اعزاز پدم بھوشن سے بھی نوازا گیا۔نہرو اور ابوالکلام آزاد سے اچھے مراسم تھے۔تقسیم سے پہلے بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔اول اول فلم ''من کی جیت'' کے گیت لکھے جنہوں نے پورے ہندوستان میں دھوم مچادی۔وہ گیتوں میں بھی کمال ہنرمندی سے تشبیہات کا استعمال کرتے تھے۔انہوں نے ''ایک رات'' اور''غلامی'' وغیرہ کے گیت بھی لکھے۔پاکستان میں بھی'' آگ کا دریا'' کے لیے نغمات لکھے جو سب عامتہ الناس میں پسند کیے گئے۔اُنہوں نے کم فلمی نغمات تحریر کیے مگر جو لکھے وہ مقبول ہوئے۔

بھارت یا پاکستان کافی عرصے تک گومگوں کی کیفیت میں رہے۔آخر احباب کے اصرار پر۱۹۶۲ء میں پاکستان منتقل ہو گئے مگر یہاں انہیں ہمیشہ اپنی ناقدری کا شکوہ رہا۔۱۹۶۶ء میں نگار ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔بہت زود گو تھے۔رباعی گو کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اہم مجموعہ ہائے کلام میں روحِ ادب،سیف وسبو،سنبل وسلاسل،آیات ونغمات اور طلوعِ سحر شامل ہیں۔عمر کا آخری حصہ اسلام آباد میں بسر ہوا۔وہیں۱۹۸۲ء میں انتقال ہوا۔

جوش کی نعت گوئی کا بھی اپنا ایک منفرد انداز ہے۔اِس لیے کہ وہ نظم کے باکمال شاعر تھے۔جو غزلیات اُنہوں نے کہیں وہ بھی ایک ہی فضا میں تھیں اور انہیں غزلِ مسلسل کا نام دیا۔لہٰذا اُنہوں نے جو نعتیں لکھی ہیں وہ ایک تو لفظیات کے چناؤ کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔دوسری بات یہ کہ اُن میں فکری بہاؤ اور روانی اپنے زورِ بیان کے ساتھ قارئین کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔اُن کے نعتیہ کلام میں دو موضوعات بے حد اہم ہیں ایک تو ظہورِ قدسی اور دوسرا اُس کے نتیجے میں عالمِ انسانیت میں برپا ہونے والا انقلاب اور اُس کے اثرات۔

نبی اکرم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری پر ہر ہر نعت گو نے لاثانی اشعار کہے ہیں۔ جوش صاحب بھی اپنی ایک نظمیہ نعت میں رسول اللہؐ کی آمد کو موضوع بنا کر ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ کون سا رسولؐ؟ پھر اِس سوال کے جواب میں خود بتاتے ہیں کہ جس کا کوئی ثانی نہیں اور

روحِ فطرت پر جس کی حکم رانی ہے وہ رسول ﷺ۔

جس کا ہر عمل اللہ کے حکم کا درجہ رکھتا ہے وہ رسول ﷺ۔ جس نے اچھائی کے لیے جہاد کا ایسا درس دیا کہ لوگ موت کو زندگی سے برتر سمجھنے لگے۔ جس نے ظلم و بربریت کا خاتمہ کیا، ایسا عدل وانصاف قائم کیا کہ تلوار انصاف کے لیے اور ظالم کے خلاف اٹھنے لگی کہ آپ دونوں جہانوں کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے۔ وہ جو خستہ حالوں اور غم زدوں کے لیے جود وسخا کا مخزن بن کر تشریف لائے وہ رسول ﷺ۔ جس نے محفلِ گیتی کا چہرہ نکھار دیا وہ رسول ﷺ۔

جس کے فقر کا مقام شاہی سے برتر تھا وہ رسولؐ دنیا میں تشریف لایا ہے۔ بھیڑ بکریاں چرانے والے بدوؤں کو جس نے شاہی کا قرینہ سکھا دیا وہ رسولؐ۔ جس نے تمام عمر ایک سپاہی کی طرح زندگی گزار کر ایک مثال قائم کر دی وہ رسولؐ۔

جس کی ہر ایک سانس قانونِ الٰہی تھی وہ رسولؐ۔ جس نے تیرہ دلوں کو حق کی روشنی عطا کر دی وہ رسولؐ۔

آ گیا جس کا نہیں کوئی بھی ثانی وہ رسول ﷺ
روحِ فطرت پر ہے جس کی حکم رانی، وہ رسول ﷺ
جس کا ہر تیور ہے ، حکمِ آسمانی ، وہ رسول ﷺ
موت کو جس نے بنایا زندگانی وہ رسول ﷺ
محفلِ سفّاکی و وحشت کو برہم کر دیا
جس نے خون آشام تلواروں کو مرہم کر دیا
فقر کو جس کے تھی حاصل کج کلاہی وہ رسول ﷺ
گلہ بانوں کو عطا کی جس نے شاہی وہ رسول ﷺ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی وہ رسول ﷺ
جس کی ہر اک سانس قانونِ الٰہی ، وہ رسول ﷺ

آپ کے انقلاب کا کیا کہنا کہ وہ انسانیت کے لیے فیضان ہی فیضان تھا۔ احسان ہی احسان تھا۔ آپؐ نے گم کردہ راہ نوعِ بشر کو سیدھا راستہ دکھایا۔ اُن کے گردن کو خود تراشیدہ اصنام کی غلامی اور بندگی سے نجات دلائی اور خدائے یکتا کی طرف اُن کی رہنمائی کر کے اللہ کریم کی پہچان کروائی۔ انہیں توحید پرست بنا دیا۔ اُن کی جبیں خدائے واحد و لاشریک کی طرف مائل بہ سجدہ ہوئی۔ آپؐ نے اپنے جلال سے ظالم اور اُن کے جبر کا سینہ شق کر دیا۔ آپ نے عظمتِ بشر کے معیارات بدل دیئے۔ شاہِ مرسلاں نے ڈوبتے ہوؤں کو ابھار دیا، بگڑے ہوؤں کو سنوار دیا۔ گویا آپؐ نے دشتِ حجاز کو گلستاں بنا دیا۔ خاردار راستے گل و ریحان سے سج گئے۔ بے نور عقل و شعور کو شعورِ حیات کا اجالا ملا تو جاہل قوم دنیا میں معزز و سر بلند ہوگئی۔

عقل انگشت بہ دنداں ہے کہ یہ سب صرف دو سال کے عرصے میں ہوگیا۔ جوش ملیح آبادی نے کمال منفرد اور دل کش اسلوبِ بیاں میں بتایا ہے کہ آپؐ کے جلال کی وہ ہیبت طاری ہوئی کہ اصنام کا رقص، رعشہ بن گیا۔ پھر وہ واقعہ معراج کا ایک مختلف اسلوب میں ذکر کرتے ہیں کہ آپؐ کے راستے کی گرد، ماہتاب کے چہرے کی تابندگی ثابت ہوئی۔

آسمانوں نے آپؐ کے نقشِ پا پر فخر کا اظہار کیا۔ یہ مضمون اکثر نعت گو شعرا کے ہاں ملتا ہے مگر جوش جیسا اسلوبِ بیان اور کسی کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔

جوش الفاظ سے سحر طرازی کرتے تھے۔ بھٹکے ہوؤں کو آپؐ اِس طرح صراطِ مستقیم پر لائے کہ وہ کاروانِ بشر کے رہنما بن گئے۔ آخری اشعار میں جوش نے کس عمدہ فکر و خیال کا اظہار کیا ہے کہ اے نوعِ بشر کرعظیم رہنما آپؐ نے ثابت کر دیا کہ مرد اسی طرح وقت کی ماتھے پر اپنی سبقت اور برتری کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ دنیا لاکھ کروٹیں لے چرخِ چنبری لاکھ گردش میں آئے، کوئی بادِ مخالف، کوئی تند و تیز آندھی آپؐ کے روشن کیے ہوئے چراغوں کو بجھا نہیں سکتی۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آزری

اے کہ ترا غبارِ رہ ، تابشِ روئے ماہتاب
اے کہ ترا نشانِ پا ، نازشِ مہرِ خاوری
تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوصِ بندگی
تیرے غضب نے بند کی رسم و رہِ ستم گری
بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر ، رشکِ خضر بنا دیا
رہزنوں کو دی ندا، بن گئے شمعِ رہبری
تو نے ثابت کر دیا اے ہادیٔ نوعِ بشر
مرد یوں مہریں لگاتے ہیں جبینِ وقت پر
کروٹیں دنیا کی تیرا قصر ڈھا سکتی نہیں
آندھیاں تیرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

جوش صاحب نے حضورؐ کے انقلاب کے اثرات اور آقائے دو عالمؐ کی تربیت کے مضمرات کو واضح کرنے کے لیے اسلامی تاریخ اور اہلِ بیت اطہارؓ کی مثالیں پیش کی ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ طبعِ حسنؓ آپ ہی کی سادگی کا آئینہ تھی۔

آلِ عبا کی ہر مقام پر برتری اور اُن کا عروج آپؐ ہی کے جذبہ کا پرتو تھا۔آپؐ کے ناز کی جھلکیاں کاکلِ حسینؓ میں تھیں اور آپؐ کا عزم اور ثبات، شہیدِ کربلاؓ کی ذات میں نظر آتا ہے۔ضربتِ حیدرِ کرار آپؐ ہی کے جلال کی علامت تھی۔

یوں لگتا تھا کہ علی اکبرؓ کی صورت آپؐ کا شباب دنیا میں لوٹ آیا ہے۔علی اصغرؓ کا غلو آپ کے زخموں کی بازیافت تھا۔

حضرت فاطمہؓ کی پرانی چادر تھی جیسے آپؐ کا فاخرہ لباس، حضرت علیؓ کا نانِ شعیر بھی آپؐ سے عظیم نسبت کی بہ دولت غذائے خوش مزہ تھی۔سبحان اللہ کیا عمدہ تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔اِس نعت سے دو اشعار املاحظہ کیجیے۔یہ نعت بھی ہے اور اہلِ بیت کی منقبت بھی:

شان ترے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلاؓ
شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدریؓ
رنگِ ترے شباب کا جلوۂ اکبرِ قتیلؓ
نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغریؓ

سب جہانوں میں مدینہ کی فضائیں بہتر
سب نظاروں میں مدینہ کے نظارے اچھے
(اکرم کُنجاہی)

حبیب جالب کی ترقی پسند نعت

حبیب جالب ۱۹۲۹ء میں مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میاں افغانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صوفی عنایت اللہ بھی پنجابی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ جالب کے بڑے بھائی مشتاق مبارک معروف شاعر اور حضرت راغب مُرادآبادی کے تلامذہ میں تھے ۔ وہ انہیں لے کر راغب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جالب اُن دنوں ''مست'' تخلص کرتے تھے۔ استاد کی محبت میں ''جالب راغبی'' لکھنے لگے مگر استاد (راغب مرادآبادی) نے انہیں حبیب جالب نام دیا جو ادبی دنیا میں مقبول ہوا۔ اُن کا انتقال ۱۹۶۸ء میں لاہور میں ہوا۔ اُن کے ایک بھائی سعید پرویز عمدہ افسانہ نگار تھے۔ اُن کا انتقال گزشتہ سال کراچی میں ہوا۔ اُردو میں جب بھی عوامی اور مزاحمتی شاعری کا ذکر ہوتا ہے تو جو نام سب سے پہلے اور فوراً ذہن میں آتا ہے وہ بلا شبہ حبیب جالب ہی کا ہے۔ اُن کے انقلابی اشعار اور نظمیں سیاسی جلسوں میں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ جالب کئی بار سیاسی جماعتوں کا حصہ بھی بنے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ کئی بار

اُن کی شعری کتب پر پابندی بھی عائد کی گئی۔ جالب ایک سچے اور حقیقی ترقی پسند تھے۔ وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ تحریک سے وابستگی نے اپس کی شاعری کو نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ حبیب جالب نے ۱۹۵۶ء میں کراچی میں بننے والی ایک فلم مس ۵۶ سے فلمی شاعری کا آغاز کیا اور کم وبیش ۴۰ سال تک دبستانِ فلم کے لیے نغمات لکھے مگر اُن کا قیام فلم نگری میں کبھی بھی مستقل نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اِس طویل وابستگی کے باوجود اُنہوں نے تقریباً ۴۵ فلموں کے نغمات لکھے۔ انہیں ''زرقا'' اور ''یہ امن'' نامی فلموں کے مندرجہ ذیل گیتوں سے بے مثال شہرت ملی:

تو کہ نا واقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

یہ فلمیں فلسطین اور کشمیر کی تحاریکِ آزادی کے موضوع پر بنی تھیں۔ جالب کے نغمات ملک کے تمام بڑے گلوکاروں مہدی حسن، نور جہاں، مسعود رانا، احمد رشدی، رونا لیلیٰ، سلیم رضا، نسیم بیگم، زبیدہ خانم، آئرن پروین وغیرہ نے گائے۔ ہم جانتے ہیں کہ حبیب جالب ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ اُنہوں نے ملک میں پسماندہ طبقات کے حقوق کی خاطر نہ قلمی جہاد کیا بلکہ عملی جدوجہد کے نتیجے میں کئی بار صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اُنہوں نے نعتیں زیادہ نہیں لکھیں مگر اُن کی محدود تقدیسی کلام کے مطالعے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کی نعوت میں بھی اُن کے ترقی پسندانہ نظریات جھلکتے ہیں۔ اُنہوں نے حضور حامیٔ انسان سے غریبوں، ناداروں اور پس ماندہ طبقات کی طرف نظرِ کرم کی التجا کی ہے۔ وہ واضح طور پر کہتے ہیں کہ دنیا اِس طرف توجہ نہیں دیتی تو کوئی غم نہیں ہمیں تو اپنے ہر درد کی دوا آپؐ سرکار کے در سے چاہیے۔ انہی سے ہمیں امید ہے کہ کرم گستری فرمائیں گے۔

اپنی غزلیہ ہئیت کی ایک غیر مردف نعت ''شاہِ عرب تیرا سہارا'' میں یہی بات کہتے ہیں کہ گردشِ افلاک کی کیا حیثیت ہے؟ وہ تو آپ ؐ کا ایک اشارہ پا کر اپنا رخ بدل لے گی۔ پھر حبیب جالبِ ایک شعر میں انقلابِ محمدی ﷺ کی بات کرتے ہیں کہ منجدھار میں پھنسی ہوئی انسان کے مقدر کی کشتی کو کھویا بن کر آپ ؐ ہی نے ساحل نشین کیا۔ آخری اشعار میں وہ آپ کو ''حاصلِ کونین'' لکھتے ہیں اور آپ ؐ سے امید کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ کی احسانات اور فیضان کی بدولت غریب کو بھی ضرور زندگی کی راحتیں نصیب ہوں گی۔ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

دنیا نہیں دیتی تو نہ دے ساتھ ہمارا
ہم کو ہے بہت شاہِ عرب تیرا سہارا
پھر آپ کی جانب ہیں زمانے کی نگاہیں
پھر ایک نظر حاصلِ کونین خدارا

اپنی ایک اور نظمیہ نعت ''بجا کملی والے'' میں بھی جالب نہ صرف سماجی و معاشرتی تفاوت کی وجہ سے مفلس و قلاش پر روا رکھے جانے والے ظلم و جبر کا ذکر کرتے ہیں۔ غربت اور امارت کی دو دنیاؤں کا فرق بڑے کرب سے بیان کرتے ہیں کہ ایک طرف روشنی ہی روشنی اور دوسری جانب مسلسل اندھیروں کا راج۔ سرمایہ داروں نے غریبوں کی عصمت وعفت کو کھلونا بنا لیا ہے۔ اپس کی عزت وتوقیر خاک میں مل چکی ہے۔ وہ غریبوں کی حالتِ زار بیان کر کے سرورِ انبیاؐ سے ملتمس ہیں اور کملی والے کو پکارتے ہیں کہ شر کی طاقتوں کی خلاف غریب کی فریاد سنیے اور خدارا مدد فرمایئے۔ مذکورہ نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

غریبوں کی عزت کھلونا بنی ہے
ازل سے امیروں کی گردن تنی ہے
کرن کوئی چھوتی نہیں بیکسوں کو
جہاں روشنی ہے وہیں روشنی ہے

نئے چاند سورج اُگا کملی والے
یہی آئی دل سے صدا کملی والے
بچا کملی والے بچا کملی والے

آزاد نے شبلی نے بھی کی جن کی ہے تفسیر
کردار کے پھولوں کے وہ باغات نہ بھولو
(اکرم کُنجاہی)

نعت کا محقق حمایت علی شاعر

۱۹۲۶ء میں اورنگ آباد (حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوئے۔ زمانۂ طالب علمی میں دکن ریڈیو اورنگ آباد سے منسلک رہے۔ کچھ عرصہ کے لیے ماہنامہ ''سازِ نو'' کا اجرا بھی کیا۔ ''جناح'' اخبار میں کام بھی کیا۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان چلے آئے۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں بطور سٹاف آرٹسٹ ملازم ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء میں ریڈیو کی ملازمت کو خیر باد کہا اور سچل سرمست کالج حیدر آباد میں لیکچرار ہو گئے۔ ''ارژنگ'' کے نام سے ایک ثقافتی ادارہ قائم کیا۔ ڈرامے تحریر کیے جن میں بطور اداکار محمد علی اور مصطفیٰ قریشی نے بھی کام کیا۔ کافی عرصہ تک جام شورو یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو سے بھی منسلک رہے۔

موسیقار خلیل احمد کراچی ریڈیو پر اُن کے ساتھ تھے۔ پہلی بار جب انہیں فلم ''آنچل'' میں موسیقی دینے کا موقع ملا تو اُنہوں نے کی ایک نظم ''ان کہی'' کے کچھ بند سلیم رضا اور ناہید نیازی کی آواز میں ریکارڈ کیے۔ یہ نظم اتنی پسند کی گئی کہ ''آنچل'' کے تمام گیت اِن سے لکھوائے گئے۔ یوں شاعر پر فلمی دنیا میں آ گئے۔ مصروفیات بڑھیں تو لاہور چلے گئے جو فلم سازی کا بڑا مرکز تھا۔ حمایت کے لکھے ہوئے فلمی نغمات جو اسٹریٹ سونگ بنے اُن کی ایک طویل فہرست ہے۔ وہ

تقریباً ۱۵ سال (۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۵ء) تک فلمی دنیا سے منسلک رہے۔عمر کے آخری ایام میں اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا چلے گئے۔نسیان کا عارضہ بھی لاحق رہا۔۲۰۱۹ء میں ٹورانٹو کینیڈا میں انتقال ہوا۔ ہماری اُردو زبان کی یہ بڑی شخصیت وہیں سپرِ دِخاک ہوئی۔

حمایت علی شاعر بڑی لاجواب ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔اُنہوں نے بہترین ملی نغمے اور جنگی ترانے بھی لکھے۔اُن کا لکھا ہوا ایک جنگی ترانہ جنگ کے پہلے ہی روز ریڈیو پاکستان لاہور میں تیار ہوا۔اُس کا پس منظر یہ ہے کہ جنگ شروع ہوئی تو اپنی مشہور ریڈیائی تقریر میں صدر پاکستان نے کہا ''ہندوستانی حکمران ابھی نہیں جانتے کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے''۔اسی جملے کو بنیاد بنا کر حمایتؔ علی شاعر نے موسیقار خلیل احمد کے ساتھ مل کر یہ گیت تیار کیا

''اے دشمن دیں تو نے کس قوم کو للکارا''

گلوکار مسعود رانا اور شوکت علی نے مذکورہ گیت کو زبردست جوش اور ولولے کے ساتھ ریکارڈ کرایا۔ جمعہ 10 ستمبر کو عین جنگ میں فلمساز ریاض بخاری اور ہدایتکار جمیل اختر کی فلم ''مجاہد'' نمائش کے لئے پیش ہوئی۔کہانی نگار ریاض شاہد تھے۔اس فلم کا مرکزی جنگی نغمہ خلیل احمد کی موسیقی میں حمایتؔ علی شاعر نے لکھا تھا:'ساتھیو مجاہدو جاگ اٹھا ہے سارا وطن'' پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے یہ دن میں کئی کئی مرتبہ نشر ہو کر فوجی جوانوں اور عوام کے دلوں کو گرماتا تھا۔

ملکہء موسیقی روشن آرا بیگم نے حمایتؔ علی شاعر کا نغمہ:''اے بھائی تیرے ساتھ بہن کی ہیں دعائیں''، ریکارڈ کروایا جو اپنی نظیر آپ ہے۔

اُن کی اہم کتب میں مٹی کا قرض، آگ میں پھول، حرف حرف روشنی، تشنگی کا سفر، شخص وعکس، ہارون کی آواز، بنگال سے کوریا تک، کھلتے کنول، آئینہ در آئینہ سے لوگ شامل ہیں۔ اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر اوج کمال نے''عقیدت کا سفر'' کے دیباچے مین اُن کی ۲۱ غیر مطبوعہ کتب کی فہرست دی ہے۔وہ پبلشر اور''دنیائے ادب'' کے مدیر بھی ہیں۔مذکورہ کتب میں جو ابھی تک اشاعت پذیر نہیں ہوسکیں اگر اُن کی اشاعت کا اہتمام کرسکیں تو اِس ادب کے زوال آشنا دور

میں ادب کی بڑی خدمت ہو گی۔

جناب حمایت علی شاعر بلا شبہ ایک ہمہ گیر ادبی شخصیت تھے۔غزل، نظم، ڈرامہ، فلمی گیت، تحقیق وتنقید، صحافت، تعلیم الغرض جس شعبہ میں گئے وہاں بڑا نام پیدا کیا۔اُنہوں نے نعت کم کہی مگر نعتیہ ادب میں اُن کی خدمات کم نہیں ہیں۔جن دنوں وہ جام شورو یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو سے منسلک تھے، اُنہوں نے دو بے حد اہم کام کیے۔یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ادبی مجلّے ''صریرِ خامہ'' کے لا جواب نعت نمبر (۱۹۷۸) اور اقبال نمبر (۱۹۷۷ء) کا اپنی نگرانی میں اجرا کیا۔اِن دونوں عظیم موضوعات پر یہ کسی بھی تعلیمی ادارے کے اولین نمبر تھے۔

۱۹۹۹ء میں نعت نگاری کی تاریخ پر اُن کی تحقیقی کتاب ''عقیدت کا سفر'' شائع ہوئی۔دراصل یہ اُن کی ٹی وی سیریل تھی جسے کتابی شکل دی گئی۔یہ ۱۳۰۰ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک سات سو سال کے دوران ابھرنے والے ممتاز ترین نعت نگاروں کے مختصر کوائف اور اُن کے نمونۂ کلام پر مشتمل تھی۔اِس کتاب میں جناب حمایت علی شاعر نے سیّد محمد حسینی سے لے کر ماہر القادری تک ۱۱۲ نعت نگاروں کا انتخاب کیا تھا۔اِس انتخاب میں اُنہوں نے دکنی دور کی نعوت کے نیچے مشکل الفاظ (جواب متروک ہو چکے ہیں) کے معانی بھی دے دیئے ہیں۔یہ دراصل انتخاب کا حصہ اول تھا۔دوسرا حصہ میری نظر سے نہیں گزرا، شاید زندگی نے انہیں مہلت نہیں دی۔

وہ امی لقب روحِ علوم تھے۔جس نکتے کو لغت اور لسانیات کے ماہرین پا نہیں سکتے، حضورؐ امی لقب نے اُن کی آسانی کے ساتھ گرہ کشائی فر دی۔رومی ورازی جیسے صاحبانِ علم وحق شناس، شہِ عرب وعجم کی تعلیمات سے فیض یاب ہو کر اِس مقام کو پہنچے کہ انسانیت اِس پر فخر کرنے لگی۔آپؐ کی علمیت کی انتہا اِس کے سوا کیا ہو کہ ام الکتاب عرش سے خالقِ کائنات نے آپؐ ہی پر اتاری۔یہی وجہ ہے کہ آپ ماہِ عرب ہیں تو شمعِ عجم۔

جو جو لفظ آپ نے اپنی زبان مبارک سے ادا کیا وہ سامعین کے لیے علم کا خزانہ تھا اور احادیثِ مبارکہ کی صورت میں صدیوں بعد آج میں مخزنِ علم ہے۔آپ کے نطق کی ارا فرازی

دیکھ کر عقل بھی دنگ رہ گئی۔ آپ کا حسنِ تکلم بھی سراپا معجزہ تھا۔ آپؐ امی لقب تھے مگر کون و مکاں کے راز داں آپؐ ہی تو تھے۔ آپ سے سارے پردے اٹھا دیئے گئے تھے۔ پھر انسانیت کیوں کہ کہے کہ آپ اہلِ علم و ادب کے سردار تھے۔ مشرق کی دانش ہو یا مغرب کی جدید علوم پر مبنی دانش، آپ امی لقب کی احادیث کے سامنے بے وقعت و بے حیثیت ہیں۔ حمایت علی شاعر نے اپنی نعوت میں غالب طور پر آپ کی علمیت کو موضوعِ نعت بنایا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم اِسی وجہ سے اُن کے مکتب سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کم علم ہیں اور وہ علم کا شہر ہیں۔ ہم ایک ذرّے سے زیادہ نہیں اور وہ علم و حکمت کے آفتابِ ضوفشاں ہیں۔ قرانِ حکیم ہی پہلی سے آخری وہی تک آپ کا زندہ معجزہ ہی تو ہے جو آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوا۔

یہ بھی آپ کی انتہائی علم کا ایک پہلو ہے کہ معراج پر مہمان بنا کر اللہ کریم نے کائنات کے سب راز آپؐ پر منکشف کر دیئے۔ لہذا ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اپس کے نقشِ کفِ پا ہی پر رواں دواں رہیں۔ آپؐ کی سیرت اور حدیث سے خوشہ چینی کرتے رہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ ذاتِ شہرِ علم تو ہم طالبانِ علم
ہم ذرّہ ہائے خاک ہیں ، وہ آسمانِ علم
قراں ہے اُس کے نطق کا اک زندہ معجزہ
اقرا سے تا بہ آیتِ آخر ، زبانِ علم
اسرارِ کائنات کا عقدہ کشا وہی
وہ راز دانِ وسعتِ کون و مکان ِ علم
ہم جستجوئے حق میں رواں اُس کے سائے سائے
ہم کو اُسی کے نقشِ کفِ پا نشانِ علم

وہ شہرِ علم ، لفظ و معانی کا نکتہ داں
حدِ مکاں میں دیکھ لیا جس نے لا مکاں

وفورِ شوق ہے میرا سنہری جالیاں ہیں
چمن اندر چمن یہ دل کی دنیا بن گئی ہے
(اکرم کُنجاہی)

بندۂ بے دام ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری ترقی پسند تحریک کے بے حد اہم رہنما تھے۔ لاہور میں جب فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے میرِ کارواں تھے تو ظہیر کاشمیری بھی تحریک کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ وہ حبیب جالب کی طرح ہمیشہ آمروں کے خلاف ڈٹے رہے۔ کبھی مصلحت نہیں کی۔ وہ ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ شعر و سخن سے شروع ہی سے دل چسپی تھی۔ جلد اِن کی شہرت لاہور سے نکل کر پورے پنجاب میں پھیل گئی کیوں کہ اُن کا کلام لاہور سے شائع ہونے والے اہم ادبی رسائل مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا اور ادبِ لطیف میں تسلسل سے شائع ہو رہا تھا۔

وہ ماہنامہ سویرا کے علاوہ روز نامہ مساوات کے بھی مدیر رہے۔ اُن کی کتب چراغ، تغزل، آخرِ شب، رقصِ جنوں، عظمتِ آدم اور کلیاتِ ظہیر کے نام سے شائع ہوئیں۔ جب کہ اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادب کے مادی نظریے'' کے نام سے شائع ہوا۔ اُنھوں نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے کئی ڈرامے بھی تحریر کیے۔

ظہیر کاشمیری نے تقریباً ۲۵ فلموں کے لیے گیت تحریر کیے۔ جن میں راگنی، بسنت

پنچھی، پردیسی بالم، آج اور کل، فرض، انجام، خونِ ناحق، اندھی محبت وغیرہ شامل ہے ایک پنجابی فلم ''ڈیرہ سجناں دا'' کے لیے بھی گیت لکھے۔ اُن کے لکھے ہوئے گیت اور فلمیں زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ خود فلم نگری سے الگ ہو گئے۔ فلم آس پاس کے مکالمے تحریر کیے۔ بہ طور فلم ساز و ہدایت کار فلم ''تین پھول'' بنائی مگر یہ فلمیں بھی کامیاب نہ ہوسکیں۔ ۱۹۹۴ء میں آپ کا انتقال لاہور میں ہوا۔

ظہیر کاشمیری نے کم کم مگر خوب صورت نعتیں بھی کہیں۔ آپؐ نے عزت وشرف کے معیارات بدل ڈالے۔ ظہورِ قدسی سے جہالت کے تاریکی دور ہوگئی۔ تقوی اور پرہیز گاری توقیر کا باعث ٹھہری۔ موج در موج آپؐ کے فیضان کا سلسلہ جاری ہوا ہر پریشاں حال کے لیے آپؐ ہمدرد اور غمخوار ہو گئے۔ ہر ظالم اور جابر کے لیے آپؐ کی ذات انصاف کا کٹہرا بن گئی۔

ظہیر کاشمیری نے اپنے ایک نعتیہ شعر میں حضور ﷺ کے لیے ''تیغِ مکافات'' کی خوب صورت ترکیب استعمال کی ہے۔ آپؐ نے عدل قائم کیا۔ عربی و عجمی، گورے اور کالے، مفلس و صاحبِ ثروت کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ برتری کا معیار یکسر ہی نہ رہی۔ سار بانوں کو بھی سر افراز کیا گیا۔

وجہ یہ تھی کہ فاران کی چوٹیوں سے پھوٹنے والی روشنی نے انسانوں کی رہبری کی اور انہیں انسانیت کی منزل کا راہی بنا دیا۔ ظہیر کاشمیری نے نیچے دیئے گئے آخری شعر میں ''گل خوبی'' کا استعارہ بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اُن ہی کی بدولت میرے نعتیہ کلام میں شگفتگی ہے۔ میرے لفظ فروزاں اور میری فکر مہک اٹھی ہے۔ میرے اشعار کی زمین شاداب ہوگئی ہے۔ میرے کلام اور تکلم میں دل کشی اور رعنائی اتر آئی ہے۔

یہ سب کچھ آقا کی مدحت کے صدقے ہوا ہے۔ لہٰذا میں اپنے رہبر و رہنما کی کون کون سے خوبی بیان کروں۔ اُن کے اوصاف لامحدود ہیں۔ بس اتنا ہے کہ میں اُن کا بندۂ بے دام

ہوں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خاکی بھی تمنّائی ہوا خلد بریں کا
مٹی ہے کہیں کی تو ارادہ ہے کہیں کا
تو سطوتِ شاہاں کے لیے تیغِ مکافات
تو مونس و ہمدرد ہر اک جانِ حزیں کا
تو مظہرِ انصاف ہے ، تو روحِ مساوات
کیا وصف بیاں ہو ترے اوصاف حسیں کا
فاراں کی تجلّی ہے مجھے رہبرِ منزل
میں بندۂ بے دام ہوں طیبہ کے امیں کا
جب سے میں ہوا ، اُس گُلِ خوبی کا ثنا خوان
دامن ہے شگفتہ مرے شعروں کی زمیں کا

ہوگئی پھر خود تراشیدہ بتوں کی رخصتی
آدمی کے دل تلک پہنچی خدا کی روشنی
(اکرم کُنجاہی)

سرور بارہ بنکوی کی چشمِ شوق

سرور بارہ بنکوی ۱۹۱۹ء میں یو پی کے ایک شہر بارہ بنکی کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔وہ شاعر،نغمہ نگاراور فلم ساز تھے۔اُنہوں نے ہاجرہ مسرور کے افسانے پگلی پر ایک لا جواب فلم ''آخری اسٹیشن'' بنائی۔کرشن چندر کے افسانے انجان پر بھی ایک فلم ''تم میرے ہو'' بنائی۔اُن کی تیسری فلم ''آشنا'' تھی۔۱۹۵۱ء میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں ڈھاکا گئے۔آئندہ سال انہیں پھر بلایا گیا۔اُنہوں نے

مشرقی پاکستان ہی میں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا۔انجمن ترقیٔ اُردو میں انہیں ملازمت مل گئی۔وہاں قیام کا عرصہ اُن کے شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی منتقل ہوگئے۔یہیں ۱۹۸۰ء میں اُن کا انتقال ہوا۔بطور گیت نگاراُن کی مشہور فلموں میں تم میرے ہو، آخری اسٹیشن،چندا،تلاش، ناچ گھر،کاجل، بہانہ،ملن،نواب سراج الدولہ، چاند اور چاندنی،احساس،سوئے ندیا جاگے پانی شامل ہیں جن کے گیت زیادہ تر مہدی حسن،مسعودرانا، مالا اور فردوسی بیگم نے گائے۔اُن کے مجموعہ ہائے کلام میں سنگِ آفتاب (۱۹۷۵ء) اور سوزِ گیتی (۱۹۸۰ء) شامل ہیں۔

سرور بارہ بنکوی اپنی زندگی کے آخری دور میں سقوطِ ڈھاکہ اور جنگی قیدیوں پر فلم بنانا چاہتے تھے۔اس فلم کا سکرپٹ مکمل ہو چکا تھا جس کا نام انہوں نے کیمپ نمبر 333 رکھا تھا۔وہ اِس فلم کی شوٹنگ کے انتظامات کو آخری شکل دینے کے لیے ڈھاکہ گئے جہاں وہ دل کا دورہ پڑنے سے 3 اپریل، 1980ء کو ڈھاکا میں وفات پا گئے۔ان کا جسد خاکی کراچی لایا گیا جہاں وہ سوسائٹی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

سرور بارہ بنکوی کی ایک نعت ملاحظہ کیجیے جو ایک ہی کیفیت اور فضا کی عکاس

ہے۔ایک عاشقِ رسول ﷺ زائر آقاؐ کے روزے پر دم بخود عقیدت واحترام سے کھڑا ہے اور اپنی محسوسات کو نعتیہ غزل میں بیان کرتا ہے۔زائرین کی وہاں حالت یہ ہوتی ہے کہ اُن کی چشمِ شوق سبز گنبد اور اُس کے مقدس مکیں کے جمال میں محو ہوتی ہے، وہاں ایسا جمال ہوتا ہے کہ ذرے بھی صد ہا جلوے اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔وہ اپنی قسمت پر ناز کرتا ہے کہ اُس دربار میں باریابی ہوئی، اذنِ حضوری ملا جہاں بن مانگے بھی عطا کے در کھل جاتے ہیں۔اُنؐ کا اندازِ التفات دیدنی ہوتا ہے اور اُس ماہِ طیبہ کا تو کیا ہی کہنا کہ اُس کے جمالِ رو چہرۂ حق کے اجالے ہر سمت ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوتے ہیں۔اُس حضوری کا اعجاز یہ ہوتا ہے کہ زائر بصد حسرت وہ شاداب خطہ چھوڑ کر آ تو جاتا ہے مگر اُس کی کیفیت تمام عمر ختم نہیں ہوتی اور عشاق جب ذرا گردن جھکاتے ہیں اُس کیفیت میں کھو جاتے ہیں۔

سرور بارہ بنکوی نے بڑے ادب، عقیدت اور احترام سے اپنی نعت میں اُس کیفیت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔وہ اپنے مقدر پر نازاں ہیں کہ بارگاہِ صاحبِ یسین وطہ کے حضور حاضر ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں جو دیکھ اور محسوس کر رہا ہوں وہ میرا خواب تھا، اللہ اللہ اب وہ خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

وہ اُس انعام، بخشش اور عطا کو اپنی بینائی کا حاصل قرار دیتے ہیں، اِس لیے کہ آنکھ نے اُس سے بہتر سحر آفریں کوئی منظر کبھی دیکھا ہی نہیں کہ آپ کی چشمِ کرم ہے، سامنے روضے کی جالی ہے اور میں اپنے بختِ رسا کے ساتھ حاضر ہوں۔میں نے اِس سے زیادہ پُر کیف اور سرور انگیز منظر کبھی نہیں دیکھا لہذا میں کیوں نہ کہوں کہ میں اور میرے سارے آبا واجداد آپؐ پر قربان ہوں۔آپ سے جو نسبت ہے وہ میری عزت وتوقیر کا باعث ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سرور نے التفاتِ سیّدِ عالم، نورِ گنبدِ خضری، خطۂ محبوبی اور نگاہِ شوق کی جو کیفیت بیان کی ہے، وہ ہر مسلمان کی خواہش اور آرزو ہی نہیں اُس کے دیدۂ خوش خواب کا سنہری سپنا ہے۔

اللہ اللہ میری قسمت، ایسا رتبہ اور میں
جاگتی آنکھوں سے دیکھوں خوابِ طیبہ اور میں
دم بخود ہیں آج دونوں، میری دنیا اور میں
بارگاہِ صاحبِ یسین و طٰہٰ اور میں
آج اِن آنکھوں کو بینائی کا حاصل مل گیا
روبرو ہے گنبدِ خضرا کا جلوہ اور میں
آپؐ کی چشمِ کرم کا میں نے دیکھا معجزہ
آپؐ کے روضے کی جالی میرے آقاؐ اور میں
آپؐ ہی چاہیں تو رکھ لیں آبرو ورنہ حضورؐ
اپنے منہ سے آپؐ کی نسبت کا دعوی اور میں
مجھ کو اذنِ بار یابی ، اور اِس انداز سے
آپؐ پہ قرباں مرے اجداد و آبا اور میں
میں جہاں پر ہوں وہاں محسوس ہوتا ہے سرور
جیسے پیچھے رہ گئے ہوں ، میری دنیا اور میں

عطا کی آپؐ نے نورِ ازل کی روشنی ورنہ
بھٹکتا اور نہ پاتا حشر تک بھی آدمی منزل
(اکرم کنجاہی)

فضل احمد کریم فضلی اور انقلابِ محمدی

فضلِ احمد کریم فضلی ناول نگار، فلم ساز اور گیت نگار تھے۔ اُن کے والد سیّد فضلِ رب فضل بھی بہت صاحب علم اور علم و ادب کے قدر دان تھے۔ اُن ہی کی نسبت سے وہ فضلی لاحقہ استعمال کرتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں بہرائچ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن الہ آباد تھا۔ اُن کا گھرانہ بہت تعلیم یافتہ تھا۔ بی اے کرنے کے بعد انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے آئی سی ایس کرنے کے بعد واپس آئے۔ اکسفورڈ یونی ورسٹی سے لٹریچر میں ڈاکٹریٹ بھی کی۔ اُن کے مقالے کا موضوع تھا "The Original Development of Persian Ghazal" ابتدا ہی سے شعر کہنے سے دل چسپی تھی۔

معروف شاعر ماجد علی ماجد اُن کے کرایہ دار تھے۔ ابتدا میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ کئی بڑے شعرا کا اُن کے ہاں آنا جانا تھا۔ بعد ازاں علامہ صفی لکھنوی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیے۔ کافی عرصہ سابق مشرقی پاکستان میں گزارا۔ اُنھوں نے ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں کامیاب مشاعروں کا انعقاد کروایا۔ فضلی نے وحشت کلکتوی کو بھی وہاں بُلا لیا۔ وہ جگر مُرادآبادی سے بھی متاثر تھے۔ جگر جب بھی کراچی تشریف لاتے، اِن کے گھر "بیت الغزل" ہی میں قیام کرتے۔ فضلی کے دو مجموعے "نغمۂ زندگی" اور "چشمِ غزال" " شائع ہوئے۔ مشرقی پاکستان کی معاشی صورت حال کے پس منظر میں اُنھوں نے ۲ ناول خونِ جگر ہونے تک" اور سحر ہونے تک" تحریر کیے۔

ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اُنھوں نے فلم سازی کی طرف توجہ دی۔ اُن کے دو بڑے بھائی حسنین فضلی اور سبطین فضلی پہلے ہی سے فلمی دنیا سے میں نام پیدا کر چکے تھے۔ لاہور بمبئی اور کلکتہ میں فضلی برادران کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ فضل احمد کریم نے بھی ناظم آباد

میں اپنی کوٹھی میں ''دبستانِ محدود'' کے نام سے دفتر قائم کرلیا۔اور ۱۹۶۰ء میں ایسٹرن اسٹوڈیوز میں اپنی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' کا افتتاح کیا۔اس فلم نے سلور جوبلی کی۔

۱۹۶۲ء میں یہ فلم نشاط سینما میں ریلیز کی گئی۔اِس کا افتتاح محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔اِس فلم کی خصوصیت یہ تھی کہ اِس میں اساتذہ امیر خسرو، مرزا غالب، میر تقی میر اور جگر مراد آبادی کا کلام شامل کیا گیا تھا۔اُن کی اپنی ایک غزل نور جہاں اور دو غزلیں طلعت محمود کی آواز میں شامل تھیں۔ جب کہ فلم میں ماہر القادری کا مندرجہ ذیل مشہور سلام بھی طلعت محمود کی آواز میں شامل تھا:

''سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی''

اُنہوں نے اپنی فلموں میں جو گیت خود تحریر کیے اُن کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر وہ ادبی معیار میں کم نہیں ہیں۔فضلی نے یہ ثابت کیا کہ ادبی اسلوب میں لکھے گئے گیت بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔فلم ایسا بھی ہوتا ہے میں اُن کے لکھے ہوئے گیت نور جہاں، احمد رشدی اور آئرن پروین نے گائے جو سارے ہی مقبول ہوئے۔آخری عمر میں دل کے مرض میں مبتلا رہے۔۱۹۸۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا اور پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

فضلی ایک پڑھے لکھے شاعر تھے۔انقلابِ محمدی ﷺ کے اثرات سے خوب واقف تھے۔اُنہوں نے ظہورِ قدسی کے انسانی معاشرے پر اثرات کو اپنے کلام میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ظاہر ہے جب شاعر انقلابِ محمدی ﷺ کا ذکر کرتا ہے تو اُس کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک تو حضور اکرم ﷺ سے پہلے کے حالات اور پھر آپ ؐ خُلقِ عظیم سے جنم لینے والے نئے حالات۔ہم جانتے ہیں کہ حضور سراپا رحمتؐ سے پہلے دنیا میں تہذیب، شائستگی اور صداقت شعاری عنقا تھی۔افق تا افق جہالت کی تاریکیوں کا راج تھا۔اِس لیے روحِ عالم پریشان و مضطرب تھی۔گمرہی تھی۔حلال و حرام کا فرق مٹ چکا تھا۔مجبور، مقہور، مظلوم اور محکوم کی سننے والا کوئی نہ تھا اس لیے کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا قانون لاگو تھا۔توحیدِ حق سے دنیا آشنا نہ تھی۔دختر کشی

اور ستی کی رسم نے شرفِ انسانی کو پامال کر کے رکھ دیا تھا۔عقل و دانش اور علم وحکمت کا وجود نا پید تھا۔حضورؐ تشریف لائے اور مکتبِ عصمت وعفت کی تعلیمات عام ہوئیں۔ظہورِ خیر البشر سے نمودِ سحر کے اثار پیدا ہوئے۔توحید اور حق پرستی کا سورج طلوع ہوا۔ایک ایسی صبح آئی جس کی تجلیات میں انسان نے وہم وگمان سے نکل کر خدائے بزرگ و برتر کی ہستی کو پہچانا۔ ہچکیاں لیتی ہوئی انسانیت کا مونس وغم خوار دنیا میں تشریف لے آیا۔مندرجہ ذیل نعت میں فضلی نے مذکورہ بالا باتوں کا اپنے سادہ اور رواں اسلوب میں احاطہ کیا ہے کہ ایک ایسی قوم جو علم کی برکتوں سے بالکل فیض یاب نہیں تھی۔زندگی گزارنے کا کوئی تہذیب یافتہ سلیقہ نہیں جانتی تھی۔آپؐ نے انہیں ایک ایسا نظام دیا جو زندگی کے ہر ہر شعبے پر محیط تھا۔آپ نے گمراہ بشر کو ہمدردیٔ خلائق کا درس از بر کروادیا جس سے ضمیر بیدار ہوئے۔شرم وحیا کا احساس جاگ اٹھا۔ یوں صحرانشین غیر مہذب لوگوں کو دنیا کا امام کردیا۔آپ کا پیغام جس نے بھی دل سے لگایا اُس کی حیات میں بہاروں نے ٹھکانہ کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے بھی آپؐ کی ذاتِ گرامی سے عشق کے آداب سیکھ لیے اور اُن کے ذکر کو مشامِ جاں کی خوشبو بنالیا، اُس کے لیے سانس لینا بھی کارِ ثواب بن گیا۔١٦ اشعار پر مشتمل اُن کی ایک نعت سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

قوم جو علم سے تھی بے بہرہ
کھول دی زندگی کی اُس پہ کتاب

بے ادب بادیہ نشینوں کو
آئے موت و حیات کے آداب

موت کو یوں بنا دیا محبوب
لوگ مرنے کو ہو گئے بے تاب

اُنؐ کا پیغام جس نے اپنایا
آ گیا اُس کی زندگی پہ شباب

روح کو اُنؐ کے عشق سے آرام
دل ہے گو اُنؐ کے عشق میں بے تاب
اُنؐ کی خوشبو نفس نفس میں ہے
سانس لینا بھی اب ہے کارِ ثواب
ذکرِ پاک اُنؐ کا اور تو فضلی
بے ادب سیکھ عشق کے آداب

مدحتِ شاہ رسولاںؐ میں مگن میرا یہ دل
زائرِ بخت رسا ویسے کا ویسا لے جا
(اکرم کُنجاہی)

منیر نیازی کا عجزِ بیاں

منیری نیازی (۱۹۲۸ء ہوشیار پور مشرقی پنجاب۔۲۰۰۶ء لاہور پاکستان) اُردو اور پنجابی زبان کے بے مثال شاعر تھے۔اُن کا اسلوبِ بیاں اور شعری تخلیقات کی فضا بالکل جداگانہ ہوا کرتی تھی۔اُنہوں نے اپنے اُردو اور پنجابی کلام میں جو علامتیں استعمال کی ہیں وہ دیگر شعرا کے اسلوب سے یک سر مختلف ہیں۔اُن کے ہاں ایک ڈر،خوف اور سراسیمگی کی کیفیت ہے۔

اُن کا مزاج بھی ہم عصروں سے مختلف تھا۔یوں وہ فلمی دنیا کے آدمی نہیں تھے مگر اُن کی بہت سی غزلیات کو فلم سازوں نے شہید،سسرال،لہو پکارے گا،تیرے شہر میں اور خریدار وغیرہ میں تبرک کے طور پر شامل کیا اور وہ غزلیات جو مہدی حسن،نور جہاں اور ناہید اختر جیسے صفِ اول کے گلوکاروں نے گائیں بہت مقبول ہوئیں۔اگر وہ با قاعدگی سے فلم نگر کے لیے گیت نگاری کرتے تو یقیناً دبستانِ فلم کا معیار بہت بلند ہو جاتا۔اُردو،پنجابی اور انگریزی میں اُن کی کوئی ۱۸ کتب منظرِ عام پر آئیں۔اُن کی پنجابی اور اُردو شاعری کی طرح،نعت بھی بالکل جداگانہ فکر و اسلوب کی حامل ہے۔ایک نعتیہ نظم ملاحظہ کیجیے:

ایک بے رشتہ جہاں میں عالمِ خلقِ خدا
اور اُس کے درمیاں اعلانِ فکرِ رہنما
ایک باطل وقت کے شام و سحر میں زندگی
ایک گم گشتہ حقیقت کے نگر میں زندگی
جس میں نا موجود تھا میں وہ زمانہ دور کا
اس میں نا آباد تھا میں وہ زمانہ دور کا
اِس زمانے میں میں اُس کا ذکر کرتا کس طرح
اُس زمانے کے سخن میں فکر کرتا کس طرح

باب روشن اِس قدر تھا اُس جہانِ حسن کا
رعب دل میں اِس قدر تھا اُس بیان ِحسن کا
حوصلہ مجھ میں نہ تھا تو بات کہتا کس طرح
یہ مرا منصب نہ تھا تو نعت کہتا کس طرح

مذکورہ بالا نعت سے اگر آخری شعر الگ کر دیا جائے تو دیگر اشعار سے پہچاننا بھی مشکل ہے کہ یہ نعت کے اشعار ہیں۔ اِس طرح کی کیفیت صہبا اختر کی چند نعتیہ نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ بہر حال کم مائیگی اور عجز و انکسار کا اظہار جو نعت نگاری کا بنیادی وصف ہے کہ یہاں شاعرانہ تعلیوں کا کام نہیں کہ نعت تو آپ ﷺ کی عطا کا معاملہ ہے۔ اُن کی نظرِ کرم کے بغیر نعت نگاری کے چمن میں پھول کھلانا ممکن ہی نہیں۔ منیر نیازی کی اپنی سوچ ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اُس زمانے میں موجود اور آباد ہی نہیں تھا جو آپؐ سرکار کا زمانہ تھا۔ منیر نے اُس عہد کو ''بے رشتہ جہاں'' کہا ہے۔ ایک مسلمان کی فکر اور فیضان کے سارے چشمے اُسی جہان سے نکلتے ہیں لہذا اُسے بے رشتہ جہاں کہنا سمجھ سے بالاتر ہے۔

اُس دور کے صبح و شام کو باطل وقت کے شام و سحر پکارا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں نعت کے لیے ضروری ہے کہ عہدِ نبوی کے سخن میں بات کی جائے۔ سوچ کے طائر کو اُس دور میں لے جایا جائے۔ مزید کہتے ہیں کہ میرے اوپر تو اُس زمانہ کا رعبِ حسن ہی بہت طاری ہے۔ لہذا میں نعت گوئی کے منصبِ جلیلہ سے کیسے کر پاؤں گا۔

پھولوں میں بھی ایسا تو کوئی پھول نہیں ہے
جیسے کہ رسولوں میں ہیں وہ فخرِ رسولاں
(اکرم کنجاہی)

یونس ہمدم کا دلِ مضطر

سیّد یونس علی جو فلمی اور ادبی دنیا میں یونس ہمدم کے نام سے مقبول ہوئے۔ جنم بھومی کے اعتبار سے دہلوی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کر کے کراچی (پاکستان) منتقل ہو گیا لہذا اُن کے بچپن اور جوانی کا زمانہ اسی شہر میں بیتا۔ اسلامیہ کالج کراچی سے بی اے کیا۔ اُن کے ایک ہم جماعت امیر محمد خان بعد ازاں موسیقار بن گئے۔ دونوں نے فلمی دنیا کا رخ کیا۔

یونس ہمدم نے کوئی دو درجن فلموں میں گیت نگاری کی۔ کراچی میں فلمی صنعت کے زوال کے بعد وہ لاہور بھی منتقل ہوئے اور وہاں بھی گیت نگاری کی۔ اُن کی اہم فلموں میں تیرے میرے سپنے، تم سا نہیں دیکھا، جانور، ہمدم، گا تا جائے بنجارہ، خوش نصیب، ٹینا، صبح کا تارا، محبت اور مہنگائی، لاڈ پیار اور بیٹی، میں چپ رہوں گی، مہندی لگی میرے ہاتھ، لال آندھی، عشق عشق، شرمیلی، کس نام سے پکاروں اور پرنس وغیرہ شامل ہیں۔ اُنہوں نے نسبتاً کم مگر اچھے گیت لکھے۔

اُن کا کلام تخلیق لاہور اور ماہِ نو میں اکثر شائع ہوا کرتا تھا۔ دو شعری مجموعے کسک اور پیاسے گلاب کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔ فلموں کے علاوہ اُنہوں نے ٹیلی وژن اور ریڈیو کے لیے بھی نغمات تحریر کیے۔ اِن دنوں امریکا میں مقیم ہیں مگر کراچی تشریف لاتے رہتے ہیں۔

دیارِ رسول ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار ہماری نعتیہ شاعری کے اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ مدینہ، روزۂ رسولؐ، سنہری جالیاں سب سے وارفتگی کا اظہار بھی نعت ہے۔ عام طور پر مدینہ منورہ کے حوالے سے تین طرح کا نعتیہ کلام نظر نواز ہوتا ہے۔

۱۔ عشقِ رسولؐ میں تڑپ، اذنِ حضوری کی آرزو۔

۲۔ پھر وہاں پہنچ کر دربارِ رسالتؐ میں حاضری کے وقت کی قلبی کیفیات، وہاں کے جلوہ ریز مناظر اور آپؐ کے کرم گستری، وہاں رحمتوں کی برسات کا ذکر۔

۳۔ واپس آ کر دل و جاں وہاں چھوڑ آنے اور دوبارہ وہاں زیارت سے فیض یاب ہونے کی تمنائیں۔

ایسا اِس لیے ہے کہ مدینہ کا کئی اعتبار سے عالمین میں تفاخر ہے۔شہرِ نبیؐ نہ صرف آیاتِ الٰہی کا امین ہے بلکہ ایمان اور یقین کا مرکز ہے۔کاسۂ جاں لے کر کوئی پہنچے تو سہی وہ مصدرِ رحم و کرم ہے۔یہی وجہ ہے کہ لوگ اُس شہر کے غبار کو دامن میں سمیٹ سمیٹ کر گھر لانا چاہتے ہیں۔چوں کہ وہ سرکار عالی مرتبت کا میزبان رہا ہے، تمام مسلمان اُسے زندگی کے گرداب میں ساحل سمجھتے ہیں۔

وہاں زائرین جو ضوفشاں مناظر دیکھتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ خطۂ محبوبی کے وہ پُر کیف نظارے مدام ہو جائیں، اُن کی زندگی میں ٹھہر جائیں کہ وہاں حضورؐ کی قربت کا احساس ہے دولتِ دنیا سے افضل و اعلیٰ ہوتا ہے۔مدینے کی مٹی میں ایسی شفا ہے کہ مریضانِ عصیاں کو وہاں صحت نصیب ہو جاتی ہے۔ یونس ہمدم کی نعتوں میں حاضری سے پہلے کی ذہنی و قلبی کیفیات کا بیان اور ایک سچے عاشق کی تڑپ نمایاں ہے۔وہ اِس جہانِ آب و گِل میں رحمتوں کی جستجو کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے درِ محمد مصطفےٰؐ سے بہتر کوئی شفا خانہ نہیں ہے۔جو سرور و کیف صحنِ مسجدِ نبوی میں سجدہ ریزی کا ہے اُس کا کسی اور حظ یا لطف سے موازنہ بے معنی ہے۔

وہ دیوانہ بن کر عازمِ مدینہ ہونا چاہتے ہیں۔ایسا دیوانہ کہ جو کبھی اپنا گریبان چاک کر لے اور کبھی رفو کرنا شروع کر دے۔وہ غارِ حرا کی عظمتوں سے خوب واقف ہیں، اِس لیے اشکوں سے وضو کر کے غارِ حرا کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔اُن کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہے کہ روزے کا در وا ہو اور میں آپؐ کے رو برو ہو جاؤں آقا کی نظرِ کرم میں آ جاؤں۔ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جہانِ رنگ و بو میں رحمتوں کی جستجو کر لوں
درِ آقا ہی جا کے پوری اپنی آرزو کر لوں

ہو صحنِ مسجدِ نبوی، کروں سجدے میں جی بھر کے
ملے موقع مدینے کی ہواؤں سے وضو کر لوں
سفر طیبہ کا ہو ، دیوانگی ہو دیدنی میری
کبھی چاک گریباں ہو، کبھی اُس کو رفو کر لوں
زیارت میں کروں غارِ حرا کی روتی آنکھوں سے
کہ جب غارِ حرا پہنچوں، وہاں اپنی جبیں دھرلوں
یہی پہلی یہی ہے آخری خواہشِ مری ہمدم
کھلے روزے کا دروازہ تو خود کو روبرو کر لوں

میں نے دیکھے ہیں کوچے مدینے کے بھی
کیا کہوں ماہ و انجم کا گھر کچھ نہیں
(اکرم گنجاہی)



شعری مجموعے

۱۔ ہجر کی چتا

۲۔ بگولے رقص کرتے ہیں

۳۔ محبت زمانہ ساز نہیں

۴۔ دامنِ صد چاک

۵۔ شاہِ کونین! کرَم (نعتیہ مجموعہ)

تحقیق وتنقید

۱۔ راغب مُرادآبادی

۲۔ نسائی ادب اور تانیثیت

۳۔ لفظ، زبان اور ادب

۴۔ غزل کہانی (پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ یافتہ)

۵۔ معاصر متغزلین

۶۔ محاسنِ فکروفن

۷۔ پس جدیدیت: لہجے اور اسلوب

۸۔ غنیمت کے اختصاریے

۹۔ لاشعور سے شعور تک: شاعری

۱۰۔ افہام وتفہیم

۱۱۔ تصریحاتِ نعت

۱۲۔ دبستانِ فلم کے نعت نگار

۱۳۔ معروضات (زیرِ طبع)

فنِ تقریر

کالج / یونی ورسٹی کے طلبا وطالبات کے لیے
(نمونے کی تقاریر کے ساتھ)

۱۔ اصولِ تقریر

۲۔ فنِ خطابت

ترتیب وتدوین

۱۔ امن وامان اور قومی یکجہتی (دیگر شعرا کی نظموں کا انتخاب)

۲۔ رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کا تجزیاتی جائزہ

۳۔ جوہرِ عروض

پیشہ ورانہ کتب (انگریزی زبان میں)

Internal Audit in Banks

An Insight into the Banking Frauds

ادبی جریدہ

سہ ماہی غنیمت (کراچی / گجرات)

ISBN: 978-969-8918-83-5